سلسلۂ اشاعت تنظیمِ اسلامی۔ ۹

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی

مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون

کے ضمن میں تنظیمِ اسلامی کی مساعی

اور ان کے تاریخی اور نظریاتی پس منظر کے حوالے سے ایک عملی تجویز

اور

جماعتِ اسلامی اور تحریکِ اسلامی

کے ساتھ وفاق کے قیام کی پیش کش

مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون

کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی مساعی

اور ان کے تاریخی اور نظریاتی پس منظر کے حوالے سے ایک عملی تجویز

اور

جماعتِ اسلامی اور تحریکِ اسلامی

کے ساتھ وفاق کے قیام کی پیش کش

از

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی، و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 - کے، ماڈل ٹاؤن، فون : 3 - 5869501

نام کتاب ـــــــــــ مذہبی جماعتوں کا باہمی تعاون اور تنظیم اسلامی

طبع اول (اکتوبر ۱۹۹۶ء) ـــــــــــ ۲۲۰۰

طبع دوم (اپریل ۱۹۹۷ء) ـــــــــــ ۲۲۰۰

طبع سوم (اگست ۲۰۰۳ء) ـــــــــــ ۲۲۰۰

ناشر ـــــــــــ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

مقامِ اشاعت ـــــــــــ ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ـــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ـــــــــــ ۱۸ روپے

مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون

کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی مساعی

مرتبہ : (حافظ) عاکف سعید
ناظم مکتبہ تنظیم اسلامی پاکستان

تنظیم اسلامی کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یہ ایک انقلابی جماعت ہے جو مسلکی و گروہی تعصبات سے بلند تر رہتے ہوئے نفاذ دین کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ دینی جماعتوں کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ ہر جماعت اپنے ہی خول میں بند ہے اور ان کے قائدین باہم اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرنے اور آپس کے اختلافات کو کم کرنے کی بجائے باہم دگر بر سرپیکار رہتے ہیں۔ یہ تاثر کچھ اتنا غلط بھی نہیں ہے' لیکن بحمد اللہ تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا یہ امتیازی وصف ہے کہ انہوں نے دیگر دینی جماعتوں اور شخصیات کے باہمی اختلافات کو سمجھنے' انہیں کم کرنے اور ان کے ساتھ اشتراک عمل کی خصوصی طور پر کوششیں کی ہیں۔ ان کوششوں اور مساعی کی کسی قدر تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ تنظیم اسلامی کے امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر یہ اللہ کا خصوصی فضل رہا کہ انہوں نے ابتداء ہی سے مختلف مکاتب فکر کے علماء و اکابرین سے ربط ضبط رکھا اور ان سے نہ صرف یہ کہ علمی و نظری استفادہ کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی بلکہ ان کے مابین فکری و عملی سطح پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں بھی مسلسل جاری رکھیں۔ تنظیم اسلامی کی تاسیس سے تین سال قبل ۱۹۷۲ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مرکزی انجمن خدام القرآن کے نام سے خدمت قرآنی کا ادارہ تشکیل دیا تھا۔ احباب جانتے ہیں کہ ۱۹۷۲ء سے لے کر سال رواں یعنی ۱۹۹۶ء تک' مرکزی انجمن خدام القرآن کے تحت ہر سال منعقد ہونے والی قرآن کانفرنسوں / محاضرات قرآنی میں محترم ڈاکٹر

صاحب مختلف مسالک اور مکتبہ ہائے فکر کے علماء و دانشور حضرات کو مدعو کر کے انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا اہتمام کرتے اور قرآن حکیم کی بنیاد پر ان کے درمیان فکری فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ قرآن کانفرنس کی کسی نشست کے صدر اگر دیوبندی مکتبہ فکر کے جید عالم ہیں تو مہمان خصوصی بریلوی مسلک کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں اور ان کی موجودگی میں تقریر کرنے والے کوئی فاضل مقرر اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں' یا اس کے برعکس بھی معاملہ دیکھنے میں آیا کہ صدارت بریلوی مکتبہ فکر کے عالم کر رہے ہیں اور مہمان خصوصی کسی دوسرے مسلک سے متعلق ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس ---ڈاکٹر صاحب محترم مختلف مکتبہ ہائے فکر کے جن علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کرتے رہے ان میں مولانا سید حامد میاں'' ، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی'' ، مولانا محمد مالک کاندھلوی'' اور مولانا محمد حنیف ندوی'' کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طالب علمی کے دور میں موصوف کا بڑا قریبی رابطہ مولانا داؤد غزنوی'' اور ان کے خانوادے سے بھی رہا۔

۲ ۔ جون ۱۹۸۲ء میں جب محترم ڈاکٹر صاحب کے ٹیلیویژن پروگرام الہدیٰ کو بند کرنے کے سلسلے میں مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین نے مظاہرہ کیا تو میاں طفیل صاحب نے جو ان دنوں جماعت اسلامی کے امیر تھے' ڈاکٹر صاحب کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے مغرب زدہ خواتین پر تنقید کی تھی اور حکومت وقت سے الہدیٰ پروگرام کو جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ انہی دنوں لاہور میں تعلیم القرآن کے نام سے منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں میاں طفیل محمد صاحب نے جملہ مسلمانان پاکستان کو دعوت دی تھی کہ وہ اسلام اور قرآن کی اساس پر متحد ہو جائیں۔ اس پر محترم ڈاکٹر صاحب نے فوری طور پر میاں طفیل صاحب کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے انہیں ایک مراسلہ بھیجا جس میں اتحاد کے لئے موصوف سے شرائط اور طریقہ کار کی وضاحت چاہی۔ میاں صاحب کی جانب سے جلد ہی ''صاف'' جواب موصول ہو گیا کہ آپ سے (یعنی ڈاکٹر اسرار احمد سے) کسی قسم کا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ تاہم ان کی جانب سے یہ مشورہ دیا گیا کہ دونوں تحریکیں اپنے اپنے

طریقہ کار اور پالیسی کے مطابق اقامت دین کا کام مثبت انداز میں جاری رکھیں اور ایک دوسرے کے کام کو پبلک پلیٹ فارم یا پریس میں ہدف ملامت و نکتہ چینی نہ بنائیں۔

بعد میں جماعت اسلامی کے موجودہ امیر محترم قاضی حسین احمد صاحب کی اسی طرح کی عوامی پیشکش کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب محترم دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مفصل تبادلہ خیال کیا لیکن امیر جماعت اسلامی کی جانب سے اس ضمن میں کوئی قابل ذکر مثبت پیش رفت سامنے نہیں آئی۔

۳۔ فروری ۸۵ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے تصور فرائض دینی پر مشتمل ایک مختصر تحریر اہل سنت کے تمام معروف مکاتب فکر کے ۶۰ سے زائد جید علماء کرام اور دیگر صاحبان علم و فضل کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ بھجوائی کہ اگر وہ اس میں کسی اعتبار سے کوئی کجی یا خامی محسوس فرمائیں تو اس پر متنبہ کریں۔ یہی تحریر ماہنامہ میثاق کے مارچ ۸۵ء کے شمارے میں بھی شائع کر دی گئی اور ان علماء کرام کے اسماء گرامی کی مکمل فہرست بھی شائع کی گئی جن کو یہ تحریر بڑے اہتمام کے ساتھ بھجوائی گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے ڈاکٹر صاحب محترم نے ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء چھ روزہ سیمینار کا بھی اہتمام کیا جس میں تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن لاہور سے وابستہ پانچ صد سے زائد رفقاء و احباب شریک ہوئے۔

یہ ایک نہایت منفرد قسم کا اجتماع تھا۔ دینی جماعتوں کی تاریخ میں اس سے قبل اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی انقلابی جماعت کے قائد نے تمام قابل ذکر مکاتب فکر کے علماء کرام کو اپنے پلیٹ فارم پر دعوت دی ہو کہ وہ آکر اس جماعت کے ارکان کے سامنے اس کے قائد کے افکار اور تصور دین کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔ چھ روزہ سیمینار میں مختلف مکاتب فکر کے ۲۱ علماء کرام اور اہل علم و فضل حضرات نے مجوزہ تحریر کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ یہ بڑا اہم موقع تھا جہاں مختلف الخیال اور مختلف مسالک سے متعلق اہل علم حضرات مل بیٹھے اور انہوں نے غلبہ دین کی جدوجہد کے حوالے سے باہم ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔ اس سیمینار میں شرکت کرنے والے نمایاں علماء کرام میں مولانا

محمد مالک کاندھلوی، مفتی سیاح الدین کاکا خیل، مفتی محمد حسین نعیمی، حافظ عبد القادر روپڑی، سید عنایت اللہ شاہ بخاری اور مولانا وحید الدین خان (انڈیا) شامل تھے۔ سیمینار میں تشریف لا کر اظہار خیال فرمانے والے اہل علم و دانش کی مکمل فہرست حسب ذیل ہے:

لاہور سے

(۱) مولانا محمد مالک کاندھلوی
(۲) مفتی محمد حسین نعیمی
(۳) حافظ عبد القادر روپڑی
(۴) سید محمد متین ہاشمی
(۵) پروفیسر حافظ احمد یار
(۶) ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
(۷) حافظ عبد الرحمٰن مدنی
(۸) قاری سعید الرحمٰن علوی
(۹) ڈاکٹر خالد علوی
(۱۰) حافظ نذر احمد

بیرون لاہور سے

(۱) مفتی سیاح الدین کاکا خیل (اسلام آباد)
(۲) سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد)
(۳) سید عنایت اللہ شاہ بخاری (گجرات)
(۴) مولانا عبد الغفار حسن (فیصل آباد)
(۵) مولانا عبد الوکیل خطیب (کراچی)
(۶) مولانا محمد اسحٰق روپڑی (کراچی)
(۷) مولانا الطاف الرحمٰن (بنوں)
(۸) مولانا شبیر احمد نورانی (کراچی)

ہندوستان سے

(۱) مولانا وحید الدین خان (دہلی)
(۲) قاری عبد العلیم (حیدر آباد)
(۳) میر قطب الدین علی چشتی (حیدر آباد)

قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر اور اس اہم معاملے کو ریکارڈ پر لانے کے لئے ان معزز اہل علم و دانش کے نام بھی ذیل میں دیئے جا رہے ہیں جنہیں اس سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا گیا تھا لیکن وہ کسی سبب سے تشریف نہ لا سکے۔ ان میں سے بعض قابل احترام علماء نے اپنے خیالات تحریری طور پر ارسال فرما دیئے تھے (ان علماء کرام میں سے کئی بزرگ اس عرصے میں انتقال فرما چکے ہیں۔ اللھم اغفر لھم وارحمھم):

مولانا سید حامد میاں، لاہور
مولانا عطاء اللہ بھوجیانی، لاہور
مفتی غلام سرور قادری، لاہور
نعیم صدیقی، لاہور
مولانا اسعد گیلانی، لاہور
جسٹس محمد تقی عثمانی، کراچی
مولانا محمد یوسف، کراچی
مولانا محمد طاسین، کراچی
مولانا منتخب الحق قادری، کراچی
مفتی ولی حسن، کراچی
شاہ بدیع الدین پیر آف جھنڈا، سندھ
مولانا محمد ازہر، ملتان
مفتی زین العابدین، فیصل آباد
مولانا اسحاق چیمہ، فیصل آباد
مولانا محمد طاہر، پنج پیر
مولانا گوہر رحمٰن، مردان
جسٹس پیر کرم شاہ، سرگودھا
مولانا محمد عبداللہ، اسلام آباد
مولانا ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ
مولانا تقی امینی، علی گڑھ
مولانا اخلاق حسین قاسمی، دہلی
جناب شمس پیرزادہ، بمبئی

مولانا عبید اللہ انور، لاہور
علامہ احسان الٰہی ظہیر، لاہور
علامہ محمود احمد رضوی، لاہور
علامہ طاہر القادری، لاہور
جسٹس ملک غلام علی، لاہور
جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، کراچی
مولانا محمد اسحٰق سندیلوی، کراچی
ڈاکٹر غلام محمد، کراچی
مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی، کراچی
مولانا سلیم اللہ خان، کراچی
مولانا سعید احمد کاظمی، ملتان
مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی، ملتان
حکیم عبدالرحیم اشرف، فیصل آباد
ڈاکٹر محمد نذیر مسلم، رحیم یار خان
مولانا محی الدین لکھوی، اوکاڑہ
مولانا خان محمد، میانوالی
مولانا سمیع الحق، اکوڑہ خٹک
مولانا عبدالقیوم حقانی، اکوڑہ خٹک
مولانا محمد منظور نعمانی، لکھنؤ
مولانا سعید احمد اکبر آبادی، انڈیا
مولانا عبدالکریم پاریکھ، ناگ پور
قاری تقی الدین، حیدر آباد

۴۔ گزشتہ تین سالوں (۹۲ء تا ۹۵ء) کے دوران ان کوششوں میں مزید اضافہ ہوا۔ تنظیم اسلامی کے اٹھارویں سالانہ اجتماع منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۶ء کے موقع پر مختلف معاصر دینی جماعتوں کے سربراہوں کو قرآن آڈیٹوریم میں تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم پر

جمع کرنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا اور پاکستان میں نفاذ دین کے طریق کار پر باہم تبادلہ خیال اور ایک دوسرے کے منہج عمل کو سمجھنے کی غرض سے ایسی اہم دینی جماعتوں کے سربراہوں کو مفصل خطاب کی دعوت دی گئی جو انتخابات کی بجائے انقلابی طریقے سے پاکستان میں نفاذ دین کے لئے کوشاں ہیں۔ اس ضمن میں بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں میں تحریک اسلامی انقلاب کے امیر مولانا مفتی سید جمال الدین کاظمی، سلاسل تصوف سے تعلق رکھنے والی ایک اہم شخصیت اور تنظیم الاخوان کے امیر مولانا محمد اکرم اعوان، تحریک فہم القرآن کے بانی میجر امین منہاس اور اہلحدیث مکتبہ فکر کی ایک اہم شاخ کے قائد پروفیسر محمد سعید نے اپنی اپنی تنظیم کے طریق کار کو بیان کیا۔ تبلیغی جماعت کے رہنما مولانا محمد احمد صاحب سے بھی بہاولپور میں رابطہ کیا گیا لیکن علالت کے باعث ان کا آنا ممکن نہ ہو سکا۔

بعد ازاں جنوری ۹۵ء میں اسی سلسلے کے تحت تحریک منہاج القرآن کے بانی و قائد پروفیسر طاہر القادری، ملتان کی معروف علمی شخصیت جناب عطاء المحسن اور لاہور کے معروف سکالر ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک کو دعوت خطاب دی گئی۔ ان حضرات نے رفقائے تنظیم کے سامنے نفاذ دین کے طریق کار کے ضمن میں اپنے اپنے موقف کو واضح کیا۔ ان تمام پروگراموں میں (بشمول ۸۵ء کے تاریخی سیمینار کے) امیر تنظیم اسلامی نے میزبان کی حیثیت سے محض سامع کے طور پر شرکت کی اور مہمان مقررین کو اظہار خیال کا بھرپور موقع دیا۔ اس طرح کی کوئی اور مثال کسی دوسری جماعت کی جانب سے ہمارے علم کی حد تک تاحال سامنے نہیں آئی۔

۵ ۔ الاخوان کے امیر مولانا محمد اکرم اعوان سے ڈاکٹر صاحب نے اسی حوالے سے کئی خصوصی ملاقاتیں بھی کیں۔ ایک خصوصی ملاقات کے لئے ڈاکٹر صاحب ان کے مرکز منارہ (چکوال) بھی تشریف لے گئے۔ بعد ازاں مولانا محمد اکرم اعوان کو اپنے ہاں قرآن اکیڈمی بھی مدعو کیا اور پاکستان میں نفاذ دین کے لئے کسی مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل پر تبادلہ خیال ہوا۔ اس ضمن میں اس تجویز پر اتفاق ہوا کہ ابتدائی قدم کے طور پر دونوں

تنظیموں کی صف دوم کے اکابر پر مشتمل ایک مذاکراتی ٹیم تشکیل دی جائے جو اشتراک عمل کی مختلف تجاویز پر غور کرے اور کوئی قابل عمل لائحہ عمل تجویز کرے۔ چنانچہ دونوں جانب سے ایک بااختیار کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کی متعدد نشستیں قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہوئیں۔ کارکنوں کے درمیان باہمی ربط ضبط بڑھانے اور مشترکہ پلیٹ فارم پر عوامی جلسے کرنے کے حوالے سے تجاویز پر مفصل گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں درج ذیل امور پر اتفاق ہوا :

i) موجودہ استحصالی اور ظالمانہ نظام جو کہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت پر مبنی ہے' کو ختم کر کے نظام خلافت یعنی رب کی دھرتی پر رب کا نظام نافذ کرنے کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ii) نظام کی تبدیلی ملک میں مروجہ انتخابات کے ذریعے ناممکن ہے۔ اس کے لئے انقلابی طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔

وہ طریقہ کیا ہو' اس سلسلے میں بات کو آگے بڑھانے کے لئے اور مشترکہ حکمت عملی کے لئے متفق نکات تک پہنچنے کی خاطر ابتدائی قدم کے طور پر مندرجہ ذیل اقدامات کئے جائیں گے :

ا) اپنی اپنی جماعت کے ممبران کو ہدایات جاری کی جائیں کہ وہ ایک دوسرے کے پروگراموں اور اجتماعات میں شرکت کریں۔

ب) اپنے اپنے زیر انتظام تعلیمی اداروں کے طلباء کو آپس میں visit کرنے' تقریری مقابلوں' کھیلوں اور دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

ج) لٹریچر کا تبادلہ کیا جائے۔ فری تقسیم کا لٹریچر بھی ایک دوسرے کو مہیا کیا جائے۔

د) مشترکہ عوامی جلسوں کا انتظام جن میں مشترک نکات بیان ہوں اور مختلف فیہ نکات زیر بحث نہ لائے جائیں۔

ھ) دونوں تنظیموں سے چند ذمہ دار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو اس بات کا اہتمام کرتی رہے کہ آپس میں طے شدہ امور پر مناسب طریق سے عمل کا اہتمام کرایا جائے۔

چنانچہ اس ضمن میں تنظیم اسلامی کی جانب سے پیش قدمی کرتے ہوئے مئی ۹۵ء میں تنظیم اسلامی کے تحت منعقدہ والٹن روڈ پر ایک بڑے عوامی جلسے میں مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کو دعوت خطاب دی گئی جو انہوں نے کمال مہربانی سے منظور فرمائی۔ اس موقع پر

دونوں تنظیموں کے رہنماؤں یعنی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور تنظیم الاخوان جناب محمد اکرم اعوان صاحب نے ایک دوسرے کی موجودگی میں خطاب کیا ------ تاہم بعد میں تنظیم "الاخوان" کی جانب سے کسی واضح لائحہ عمل کے سامنے نہ آنے کے سبب مذکورہ بالا بااختیار کمیٹی کی بات چیت آگے نہ بڑھ سکی۔

دوسری جانب یہ صورتحال نہایت ہی افسوسناک ہے کہ تنظیم اسلامی کی جانب سے کی گئی ان قابل قدر مساعی کے باوجود کسی ایک جماعت کی طرف سے بھی امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر صاحب کو اپنے پلیٹ فارم پر اظہار خیال کی بھی دعوت نہیں دی گئی' اور نہ ہی اس مشن کو آگے بڑھانے کے لئے کسی دوسری جماعت نے مشاورتی میٹنگ کا کبھی اہتمام کیا۔ بعض جماعتوں کے قائدین کی جانب سے تنظیم اسلامی کی ان مساعی کے جواب میں بعض مواقع پر اس عزم کا اظہار بھی ہوا کہ مجوزہ مقاصد کے حصول کے لئے آئندہ وہ بھی اپنے ہاں ایسے پروگرام کریں گے' لیکن "اے بسا آرزو خاک شدہ" کے مصداق تاحال اس قسم کی کوئی کوشش کسی دوسری جماعت کی طرف سے سامنے نہیں آئی۔ محترم ڈاکٹر صاحب بحمد اللہ اس ناموافق صورتحال کے باوجود بددل اور مایوس نہیں ہوئے بلکہ

اک طرز تغافل ہے ' سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے ' سو ہم کرتے رہیں گے

کے مصداق انہوں نے اپنی مساعی جاری رکھیں۔

۶ ۔ ڈاکٹر صاحب محترم اس حقیقت سے پورے طور پر آگاہ ہیں کہ مختلف مسلکوں کے فروعی اختلافات میں موجود غیر معمولی شدت اس راہ کی بڑی رکاوٹ ہے' جسے جماعتوں کے سربراہان کو عبور کرنے میں وقت کا سامنا ہے۔ چنانچہ گزشتہ برس محترم ڈاکٹر صاحب نے مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ضمن میں ان کے تاریخی اور نظریاتی پس منظر کے حوالے سے ایک نئی عملی تجویز پیش کی۔ یہ پرخلوص تجویز محترم ڈاکٹر صاحب نے پہلے اپنے ۲۵ ستمبر ۹۵ء کے خطاب جمعہ بمقام دارالسلام باغ جناح میں وضاحت کے ساتھ پیش

کی۔ اور بعد ازاں اسے پوری تفصیل کے ساتھ ماہنامہ میثاق کے ماہ اکتوبر ۹۵ء کے شمارے میں شائع بھی کر دیا گیا۔ اس میں انہوں نے دیوبندی' بریلوی اور اہلحدیث مسالک کے مختلف پارٹیوں میں تقسیم رہنماؤں کو اپنے اپنے مسالک کی بنیاد پر اپنے فروعی اختلافات کو بھلا کر اکٹھا ہونے کی طرف توجہ دلائی۔ مزید برآں امیر تنظیم نے اس مبارک عمل کا آغاز خود کرتے ہوئے مشترک تاریخی اور نظریاتی پس منظر رکھنے والی تین جماعتوں یعنی تنظیم اسلامی' جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے وفاق کی نہ صرف تجویز پیش کی بلکہ اس ضمن میں خود آگے بڑھ کر جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے ساتھ اشتراک عمل کی پیشکش بھی کی۔ اس تجویز پر تحریک اسلامی کی جانب سے تو کسی قدر مثبت ردعمل سامنے آیا لیکن جماعت اسلامی نے اس تجویز کو درخور اعتناء نہیں سمجھا۔

۷۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ گزشتہ تین چار برسوں کے دوران تحریک خلافت پاکستان جس کے "داعی" محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی ہیں' اور جسے تنظیم اسلامی ہی کا ایک شعبہ قرار دیا جا سکتا ہے' کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے خلافت سیمینارز اور خلافت کانفرنسوں میں بھی تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور دانشوروں کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شیعہ عالم دین جناب ہادی علی نقوی بھی محترم ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر تحریک خلافت کے ایک پروگرام میں تشریف لا کر اظہار خیال فرما چکے ہیں۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ گزشتہ سال سالانہ اجتماع کے موقع پر منعقد ہونے والی دوسری عالمی خلافت کانفرنس کے مقررین میں دیگر مقررین کے علاوہ جماعت اسلامی کے مولانا گوہر رحمن صاحب اور تحریک اسلامی کے حکیم سرد سہارنپوری بھی شامل تھے ------ اور ابھی دو ماہ قبل ۱۸ / اگست کو قرآن کالج کی تقسیم اسناد کی تقریب میں محترم ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر تحریک اسلامی کے دونوں دھڑوں کے قائدین یعنی جناب نعیم صدیقی اور مولانا مختار گل ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ محترم نعیم صدیقی صاحب اگرچہ اپنی علالت کے باعث تقریر نہ فرما سکے تاہم وہ شدید علالت اور ضعف کے باوصف محترم ڈاکٹر صاحب سے

کئے گئے وعدے کو نبھانے جلسہ گاہ تک تشریف لائے۔ اس تقریب میں بھی جماعت اسلامی کی نمائندگی مولانا گوہر رحمان صاحب نے کی۔

اس طرح ایک سٹیج پر تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک اسلامی کے امیر مولانا مختار گل اور جماعت اسلامی کے ایک اہم رہنما مولانا گوہر رحمان کے بیک وقت جمع ہو جانے سے تینوں جماعتوں کے وفاق کا جو خواب امیر تنظیم اسلامی نے دیکھا تھا اس کی ایک ابتدائی جھلک عملاً دیکھنے کو ملی۔ یہ سب کچھ اللہ کی تائید و توفیق سے ہوا جس نے محترم ڈاکٹر صاحب کی ان مساعی کو شرف قبول سے نوازا ہے۔ فللہ الحمد والمنہ

بحمد اللہ، تنظیم اسلامی کامل یکسوئی کے ساتھ منہج انقلاب نبوی کی رہنمائی میں پاکستان میں اللہ کے دین یعنی نظام خلافت کے قیام کے لئے جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے اور پورے خلوص اور وسعت قلبی کے ساتھ اشتراک عمل کی ہر معقول تجویز پر غور کرنے اور اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے پہلے بھی آمادہ رہی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی رہے گی۔ OO

مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون کے ضمن میں
ان کے تاریخی اور نظریاتی پس منظر کے حوالے سے ایک عملی تجویز
اور... جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے ساتھ
وفاق کے قیام کی پیش کش

از : ڈاکٹر اسرار احمد

(خطاب جمعہ ۲۵ اگست ۱۹۹۵ء' بمقام مسجد دار السلام لاہور)

خطبہ مسنونہ' آیاتِ قرآنی کی تلاوت اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا :

حضرات! آج میں ایک بہت اہم موضوع پر' لیکن محض نظری سطح پر نہیں بلکہ عملی پہلو سے' گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اتحادِ اُمّت کا وعظ کہنا بہت آسان ہے۔ اور ہر شخص جو بھی دین اور پاکستان کا بہی خواہ ہے یہ اس کے دل کی آواز ہے کہ تمام دینی جماعتوں کو جمع ہو جانا چاہئے۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ بیل منڈھے چڑھے کیسے؟ اس میں کوئی ابتدائی قدم کونسا ہو سکتا ہے؟ اس اعتبار سے اِس وقت میں قرآن حکیم کے مختلف مقامات سے پانچ آیات کے ٹکڑے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ پہلے ان کا کسی قدر مفہوم سمجھ لیجئے۔ سب سے پہلے سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کا ابتدائی جزو' جو اس آیۂ مبارکہ کا جزوِ اعظم ہے' ملاحظہ فرمائیں :

﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ﴾

"(اے مسلمانو!) ہم نے تمہارے لئے از قسمِ دین (یا دربارۂ دین) وہی مقرر کیا ہے کہ جس کی ہم نے وصیت کی تھی نوح کو اور جس کی وحی کی ہے ہم نے (اے محمد ﷺ)

آپ کی جانب اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کہ قائم کرو دین کو اور اس کے بارے میں ٹکڑے ٹکڑے مت ہو جاؤ"۔

"دین" اور "شریعت" کا فرق

سورۃ الشوریٰ کی یہ آیت قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں سے ہے اور "اتحادِ اُمت" کے ضمن میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس موضوع پر چونکہ مجھے آج بہت طویل مضمون cover کرنا ہے لہٰذا میں اس آیت پر آج زیادہ وقت صرف نہیں کر سکتا۔ کچھ ہی عرصہ قبل میں نے اِسی جگہ اہلِ تشیع کی خدمت میں کچھ گزارشات جب پیش کی تھیں تو اس پر تفصیل سے گفتگو ہوئی تھی۔ میری وہ تقریر "میثاق" کے علاوہ ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اِس وقت صرف حوالہ دینا مقصود ہے۔

"شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ" کے دو ترجمے ہیں۔ ایک ترجمے کی رُو سے مفہوم یہ ہو گا کہ تمہارے لئے بھی دین وہی مقرر کیا ہے جو حضرات انبیاء و رُسل نوح' ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا تھا۔ گویا کہ دین ایک ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ ہو گا کہ دین کے بارے میں تم پر بھی وہی بات فرض کی گئی ہے جو نوح' ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام پر فرض کی گئی تھی' یعنی "اَقِيْمُوا الدِّيْنَ" کہ دین کو قائم کرو' البتہ یہ دونوں ترجمے مفہوم کے اعتبار سے ایک ہی بن جائیں گے کیونکہ سارا زور ان الفاظ پر ہے : "اَقِيْمُوا الدِّيْنَ" (دین کو قائم کرو) "وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ" (اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!) یہاں پر "فِيْهِ" کا لفظ بہت اہم ہے۔ اکثر لوگوں نے اس "فِيْهِ" کا حق ادا نہیں کیا ہے اور سمجھا ہے کہ جیسے بعض دوسرے مقامات پر "وَلَا تَتَفَرَّقُوْا" اور "وَلَا تَفَرَّقُوْا" کے الفاظ میں "فرقہ فرقہ مت بنو' گروہوں میں تقسیم مت ہو جاؤ" کی ہدایت دی گئی ہے' شاید اسی طرح کی یہ بھی ایک ہدایت ہے۔ لیکن یہاں "فِيْه" کا اضافہ ہے' جس کا تقاضا ہے کہ دین میں تفرقہ نہ ہو۔ دین کیا ہے؟ دین اصلاً نام ہے اس کا کہ حاکمِ مطلق اللہ ہے اور اس کا نمائندہ اس کا رسول ہے۔ یعنی "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه"۔ اور اسلامی ریاست کا کُل دستور اِن الفاظ مبارکہ میں مضمر ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے اس طرح پیش کیا ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی' باقی بتانِ آزری

اور

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

چنانچہ دین یہی ہے جو ہمیں "لاالٰہ الّاالله محمّدٌ رسول الله" کے الفاظ میں بتادیا گیاہے اور یہ دین ہمیشہ سے ایک رہا ہے۔ پہلے موسیٰؑ رسول اللہ تھے' اس سے پہلے ابراہیمؑ نبیّ اللہ تھے۔ رسولوں کے نام بدلتے جائیں گے لیکن کلمہ یہی ہو گا۔ تو دین ایک ہے۔ اور یہاں فرمایا گیا کہ دین کے ٹکڑے نہ کرو۔ دین ایک اکائی ہے' یہ ایک حیاتیاتی وحدت (Organic Whole) ہے' اِس کے حصے بخرے مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دین کا ایک حصہ تو اللہ کے تابع ہو اور ایک حصہ ہماری مرضی کے تابع۔ اس کا ایک حصہ ہمارے رواج کے تابع ہو تو ایک حصہ زمانے کے تقاضوں کے تابع۔ اس طرح دین تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ گویا۔

اڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی داستاں میری!

اسی مفہوم کی ادائیگی کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں : "اَلَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ" یعنی "انہوں نے اپنے دین کو پھاڑ ڈالا' دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا"۔ ایک ہے خود متفرق ہو جانا' فرقوں میں بٹ جانا' لیکن "فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ" کی ترکیب میں "دین" مفعول بہٖ ہے۔ یعنی انہوں نے دین ہی کے ٹکڑے کر ڈالے۔

"وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ" کے الفاظ میں دو ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پہلی یہ کہ دین کی اِس کُلیت اور اس کی ہمہ گیریت اور اس کے ہمہ پہلو ہونے کو برقرار رکھو۔ اس میں تفرقہ نہ ہو' اس میں ٹکڑے نہ ہوں' اس کے حصے بخرے نہ ہوں کہ کچھ اللہ کو دو اور باقی کچھ کسی اور کو دے دو۔ "جو خدا کا ہے خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے قیصر کو دو" کا فلسفہ دین میں تفرقہ کے مترادف ہے۔ "وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ" کے الفاظ میں دوسری ہدایت یہ ملتی ہے کہ

اقامتِ دین کے لئے تفرقہ نہ ہو۔ "فِیہ" میں ضمیر مجرور (ہ) یا دین کی طرف جائے گی یا اقامتِ دین کی طرف۔ دین کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ہمیشہ سے ایک رہا ہے' البتہ شریعتیں جدا رہی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور تھی' اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شریعت اور ہے۔ لیکن جہاں تک دین کا تعلق ہے وہ محمد ﷺ کا بھی وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ دین تو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی ہے۔ شریعتوں میں فرق ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ اسی طرح دین اسلام کے اندر مختلف فقہیں اور مسالک مختلف ناموں سے---- مثلاً فقہ حنفی' فقہ شافعی' فقہ مالکی' فقہ حنبلی اور فقہ جعفری ---- موجود ہیں۔ لیکن ان کو دین میں تفرقے کی بنیاد بنایا جانا بہر صورت غلط ہے۔

سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کے بعد اب ہم سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۲ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کی چند سورتیں ایسی ہیں کہ جن میں مختلف اعتبارات سے انبیاء کرام کے اسماء گرامی کا بڑا خوبصورت گلدستہ آیا ہے۔ انہی میں سے ایک مقام سورۃ الانبیاء بھی ہے۔ اس میں بہت سے انبیاء ورُسل کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا :

﴿اِنَّ ھٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴾

"بیشک تمہاری یہ امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس تم میری ہی عبادت کرو"۔

یعنی خواہ وہ ابراہیمؑ ہوں' اسماعیلؑ ہوں' اسحاقؑ ہوں' یعقوبؑ ہوں' لوطؑ ہوں' نوحؑ ہوں' داؤدؑ ہوں' سلیمانؑ ہوں' ایوبؑ ہوں' ادریسؑ ہوں' یونسؑ ہوں یا زکریاؑ ہوں (علیہم الصلوٰۃ والسلام) ان سب کا تعلق ایک ہی ملت سے ہے۔ اور ان سب کو ایک ہی حکم دیا گیا تھا کہ میں تمہارا رب ہوں' تمہیں میرا حکم ماننا ہے' تم میری بندگی کرو۔ اور اسی کا نام دین ہے۔

رسولوں کے "منہاج" مختلف تھے!

اس کے بعد اب سورۃ المائدہ کی آیت ۴۸ کے اس جزو پر توجہ مرکوز کیجئے :

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾

”تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور ایک منہاج مقرر کیا ہے“۔

ظاہر بات ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء و رُسل ایک ہی امت سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن پھر انبیاء و رسل کی امتیں بھی ہیں۔ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد (علیہم الصلوٰۃ والسلام) یہ سب ایک اُمت ہیں، لیکن ایک امتِ موسوی ہے، ایک امتِ عیسوی ہے اور ایک امتِ محمدی ہے۔ چنانچہ ایک اعتبار سے اگر یہ ساری ایک امت ہے تو دو اعتبارات سے ان میں فرق ہے۔ یہ فرق سورۃ المائدہ کے زیر نظر الفاظ ”لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا“ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں پر ہر امت کے لئے دو چیزیں معین کئے جانے کا ذکر ہوا ہے، ایک شریعت اور دوسری منہاج۔ شریعت کی بات تو واضح ہو چکی۔ مثلاً شریعتِ موسوی اور شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جدا جدا ہیں۔ اسی کے تابع ہمارے ہاں فقہیں ہیں۔ لیکن یہ منہاج کا فرق کیا ہے؟ یہ بات میں آج پہلی بار بیان کر رہا ہوں۔

مجھے جب کسی خاص موضوع پر گفتگو کرنی ہوتی ہے اور اس کے اعتبار سے جب میں قرآن حکیم کو دیکھتا ہوں تو کوئی اور نیا پہلو نظر آ جاتا ہے جو اس سے پہلے میری نظر سے مخفی تھا۔ قرآن حکیم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ”لَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهٗ“ یعنی ”اس قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے“۔ ”وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ“ بار بار کے پڑھنے سے اس پر کوئی بوسیدگی طاری نہیں ہوگی، اس سے آدمی کا جی نہیں اکتائے گا۔ اسے پڑھتے رہو، پڑھتے رہو تو یہ نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ ”وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ“ اور اصحابِ علم اس سے کبھی سیر نہیں ہو سکیں گے۔ بلکہ علم کی پیاس بڑھتی ہی رہے گی۔

اب آپ نوٹ کیجئے کہ ”منہاج“ سے کیا مراد ہے؟ کیا تمام رسولوں کا منہاج ایک نہیں تھا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ”لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا“ کے الفاظ وضاحت کر رہے ہیں کہ جیسے شریعتیں جدا تھیں، ایسے ہی منہاج بھی جدا تھا۔

منہاجِ ابراہیمیؑ : اب ذرا تجزیہ کیجئے کہ منہاجِ ابراہیمیؑ کیا تھا؟ آپؑ نے جگہ جگہ توحید

کی دعوت کے مراکز قائم کیے۔ آپؑ کی زندگی میں کوئی ریاست قائم کرنے کی جدوجہد نظر نہیں آتی۔ آپؑ نے اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عامورہ اور سدوم کی طرف بھیج دیا کہ وہ وہاں جا کر دعوتِ توحید کا ایک مرکز قائم کریں۔ ایک بیٹے اسماعیلؑ کو لا کے حجاز میں آباد کر دیا۔ (رَبَّنَا اِنِّیٓ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِیۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ) چنانچہ ایک مرکز حجاز میں بن گیا، جبکہ دوسرے بیٹے اسحاقؑ کو فلسطین میں آباد کر دیا۔ اگر آپ اس پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اس منہاج پر ہمارے صوفیاء اور اولیاء اللہ نے کام کیا ہے۔ انہوں نے کفر و شرک کے مراکز میں ایمان کی شمعیں روشن کیں اور خانقاہیں آباد کیں، جہاں پر آنے والے لوگوں کا انہوں نے تزکیہ کیا۔ ان خانقاہوں کو آپ آج کل کی خانقاہوں پر قیاس نہ کیجئے۔ پچھلے زمانے میں روحانی اور باطنی علوم کی تلقین و تعلیم، ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد شروع ہوتی تھی۔ قرآن، حدیث اور فقہ جیسے علوم کی تحصیل کر چکنے کے بعد لوگ سلوک کی منازل طے کرتے۔ یہ نہیں کہ "ا" کا نام "ب" نہیں جانتے اور سجادہ نشین بھی ہیں اور کسی شیخِ طریقت کے خلیفۂ مجاز بھی ہیں۔ اس طرح کے لوگ تو اِس دور کی پیداوار ہیں جب ہم نے دین کو دھندا اور profession بنا لیا۔ جبکہ اگلے وقتوں کے مشائخِ عِظام، دین کے عالم بھی ہوتے تھے۔ وہ اپنے تربیت یافتہ خلفاء کو مختلف مقامات پر بھیج دیتے جہاں دعوتِ دین اور اصلاح و ارشاد کے مراکز قائم ہو جاتے۔ چنانچہ شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج رحمہ اللہ تعالیٰ نے پاک پتن سے اپنے خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دہلی بھیجا کہ وہاں پر دعوت و اصلاح کا مرکز قائم کریں۔ اسی طرح شیخ صابرؒ کو کلیر اور شیخ جمالؒ کو ہانسی میں مراکز قائم کرنے کے لئے بھیجا، جبکہ اپنے ایک داماد کو اپنے پاس رکھا جو وہاں کے جانشین بنے۔ اور پھر نظام الدین اولیاءؒ سے جو سلسلہ چلا ہے، اس کے کیا کہنے، ایک ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار مسترشدین ان کی خانقاہ میں تربیت حاصل کر رہے ہوتے تھے۔ یہ حضرات خود تربیت حاصل کرنے کے بعد پورے ہندوستان کے اندر پھیل گئے۔ تو یہ منہاجِ ابراہیمیؑ ہے۔

<u>منہاجِ موسویؑ</u> : اب غور کیجئے، منہاجِ موسوی کیا تھا؟ آپؑ کی سب سے اہم کوشش ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کو غلامی سے نجات دلانے کی تھی۔ جیسے ہی حکم ہوا :

"اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی" (جایئے فرعون کی طرف، وہ سرکش ہو گیا ہے) تو جاتے ہی پہلی بات یہ کہی : "اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِی اِسْرَائِیْلَ وَلَا تُعَذِّبْھُمْ" یعنی "بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو، انہیں عذاب مت دو!" انہیں اجازت دو کہ جہاں سے آئے تھے وہاں واپس چلے جائیں۔ تم نے انہیں زنجیروں میں جکڑ لیا ہے، غلامی کے شکنجے میں کس لیا ہے، تم ان سے بیگار لے رہے ہو، انہیں چھوڑ دو کہ یہ فلسطین کو واپس لوٹ جائیں۔ اور وہ قوم اِس قدر بگڑی ہوئی قوم تھی کہ حضرت موسیٰؑ کے نو (۹) کھلے معجزے دیکھنے کے بعد، اور فرعون کی غلامی سے نجات اور مصر سے ہجرت کے بعد جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو تو پوری قوم میں سے دو آدمیوں کے سوا کوئی جان کی بازی لگانے کے لئے تیار نہ تھا۔ وقت کے رسول حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے علاوہ کُل دو افراد اس کام کے لئے تیار ہوئے یعنی حضرت یوشع بن نون اور حضرت کالِب بن یفنّا۔ گویا چھ لاکھ کے مجمع میں سے چار آدمی اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلے۔ کوئی تصور کر سکتا ہے کسی قوم کی ناہنجاری کا؟ پھر یہ وہ بد بخت قوم تھی کہ سارے معجزے دیکھنے کے باوجود جیسے ہی انہیں غلامی سے نجات ملی اور مصر سے نکلے تو اللہ کے پیغمبرؑ سے یہ کہنے لگے کہ ہمارے لئے بھی کوئی بُت بنا دو جس کی ہم پوجا کیا کریں۔ موسیٰ علیہ السلام چالیس دنوں کے لئے کوہ طور پر گئے تو ان کے پیچھے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ لیکن بہرحال وہ ایک مسلمان قوم تھی، کلمہ اس کا وہی تھا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" لہٰذا حضرت موسیٰؑ نے اس کی نجات کی فکر کی۔ یہ منہاجِ موسویؑ تھا۔ اس خاص پہلو سے یہ کہا جا سکتا ہے اس منہاج پر مسلم لیگ نے کام کیا ہے۔ چنانچہ تحریک پاکستان اس بنیاد پر چلی کہ برِّعظیم پاک و ہند کے اندر دس کروڑ مسلمان بس رہے ہیں، اگر کہیں ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو گیا تو ہندو ان پر ظلم کریں گے، ان کے ثقافتی تشخص تک کو ختم کر دیں گے، ان کو شدھی کرنے کی تحریک چلائیں گے، ان کا معاشی استحصال کریں گے، لہٰذا ہندو کی غلامی سے بچاؤ کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہندوستان کا بٹوارہ کر دو، اور ہمیں دو ٹکڑے ایسے دے دو جہاں ہماری اکثریت ہے تاکہ ہم وہاں اپنے تمدن کے مطابق نظام چلائیں۔ مسلم لیگ نے جو منہاج اختیار کیا یہ منہاجِ موسویؑ سے بہت زیادہ قریب ہے۔

منہاجِ عیسویؑ : اب ایک قدم اور آگے آیئے' منہاجِ عیسوی کیا ہے؟ اللہ کا ایک بندہ گشت لگا رہا ہے' آج یہاں ہے' کل وہاں ہے' پرسوں وہاں ہے' ابھی کوہِ زیتون پر ہے' ابھی جھیل گلیلی پر پہنچا ہوا ہے' اور ابھی کہیں نظارت میں ہے۔ یہاں وعظ کہا' وہاں وعظ کہا۔ مچھیروں سے خطاب کیا : "اے مچھلیوں کے پکڑنے والو' آؤ میں تمہیں انسانوں کا شکار کرنا سکھاؤں۔" بارہ آدمی مل گئے تو ان بارہ کو بھی اپنے ساتھ ہی چکر میں ڈال دیا کہ یہ نہیں کہ تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو' بلکہ میرے اعوان و انصار بنو اور میرے ساتھ نکلو! اپنی صلیب اٹھاؤ اور میرے ساتھ آ جاؤ!! مطلب یہ کہ اس راستے میں اپنی جان دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ یہ حوارییّنِ مسیحؑ بھی آپؑ کے ساتھ اس کام میں لگ گئے۔ یہ کام بھی ایک مسلمان امت میں ہو رہا تھا۔ یہود ایک مسلمان امت تھے۔ اس امت میں ایک کام اس سے قبل انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کا ہوا جو منہاج موسویؑ کا کام تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت جتنی بھی ہو سکتی تھی موسیٰ علیہ السلام نے کی' لیکن منہاج موسویؑ میں بنیادی عنصر بنی اسرائیل کی آزادی کا تھا۔ اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام دین کی حکمت لے کر آئے (جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ) اور آپؑ نے دین کی حقیقت کو واضح کیا۔ آپؑ نے علمائے یہود کو خطاب کر کے کہا کہ تم نے دین کو بے جان رسومات کا مجموعہ بنا کے رکھ دیا ہے' تمہاری مثال ان قبروں کی سی ہے کہ جن کے اندر گلی سڑی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا' مگر ان پر اوپر سے رنگ روغن کر دیا جاتا ہے اور ان پر شاندار چادریں چڑھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ تم سانپ کے سنپولیوں کی مانند ہو۔ آپؑ کی یہ ساری تنقیدیں علمائے یہود پر تھیں۔ جو لوگ آپؑ کے ساتھ آ گئے انہیں بھی آپؑ نے اپنے ساتھ گشت پر لگا دیا۔ ہمارے ہاں اس منہاج پر تبلیغی جماعت نے عمل کیا ہے یا بعض صوفیاء نے۔ اکثر صوفیاء تو وہ تھے جنہوں نے اپنا ایک مرکز بنا لیا تھا اور "قطب از جانمی جنبد" کے مصداق ایک جگہ بیٹھ کر انہوں نے اپنے تربیت یافتہ لوگوں کو اِدھر اُدھر بھیجا' لیکن بعض صوفیاء وہ تھے جو قریہ قریہ بستی بستی جا کر لوگوں کو دعوت دیتے اور ان کی اصلاح کرتے' جیسے مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمتہ اللہ علیہ۔ تبلیغی جماعت کے کام میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منہاج سے مشابہت موجود ہے۔ یہاں ایک وضاحت ضروری

ہے کہ مشابہت سے مراد کُلّی مشابہت نہیں ہوتی۔ میری بیان کردہ تمام تشبیہات کو، آپ کہیں کُلّی طور پر منطبق نہ کر لیجئے۔ تشبیہ کا استعمال بالعموم دو مختلف اشیاء کے مابین پائی جانے والی جزوی مشابہت کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے میں نے منہاجِ موسوی کے لئے مسلم لیگ کی اور منہاجِ عیسوی کے لئے تبلیغی جماعت کی مثالیں دی ہیں۔

منہاجِ محمدیؐ : اب آیئے منہاج محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف۔ اور جان لیجئے کہ یہ دور اصلاً منہاجِ محمدیؐ کا دَور ہے۔ منہاجِ محمدیؐ یہ ہے کہ سب سے پہلے دعوت دو، جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسے قبول کریں، انہیں منظم کرو، ان کی تربیت کرو، انہیں ایک طاقت بناؤ اور کوڑے کی صورت میں نظامِ باطل کے اوپر دے مارو اور نظامِ باطل کا بھیجا نکال دو۔ ازروئے الفاظِ قرآنی "بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ" یعنی "ہم باطل کے اوپر حق کا کوڑا دے مارتے ہیں جو اس کا بھیجا نکال دیتا ہے اور وہ تو ہے ہی زائل ہو جانے والی شے"۔ یہ منہاجِ محمدیؐ ہے۔ یہ انقلاب برپا کرنے اور نظام کو بدلنے کے لئے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا عطا کردہ طریق کار ہے۔ اس حوالے سے آپ ﷺ دنیا کے سب سے بڑے انقلابی راہنما ہیں۔

گاندھی جی کے بارے میں غالباً برنارڈ شا نے کہا تھا :

"He is a saint among politicians and a politician among saints."

یعنی وہ اگر سیاست دانوں میں بیٹھا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو کوئی سادھو ہے، سیاست دان تو لگتا ہی نہیں اور جب سادھوؤں میں بیٹھا ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ یہ تو سیاست دان ہے۔ اس اسلوبِ کلام کے حوالے سے میں یہاں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک بات عرض کر رہا ہوں، اگرچہ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" کے مصداق دنیا بھر کے انقلابی راہنما سیرت و کردار اور اعلیٰ ترین اخلاق و اطوار غرضیکہ کسی بھی اعتبار سے آپؐ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، لیکن بات سمجھانے کے لئے یہ اندازِ تعبیر اختیار کر رہا ہوں کہ

"He is a revolutionary among Prophets and a Prophet among revolutionaries."

"آپ ﷺ انبیاء کرامؑ کے درمیان ایک انقلابی ہیں اور انقلابیوں کے مابین ایک

نبیؑ ہیں"۔

انقلابیوں (Revolutionaries) میں آپ رکھئے مارکس ' اینجلز' لینن ' والٹیر اور روسو وغیرہ کو۔ لیکن محمدؐ رسول اللہ ﷺ ایک عظیم انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جلیل القدر پیغمبر بھی ہیں۔ اور تمام انبیاء و رسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) میں آپؐ اس اعتبار سے ممتاز ہیں کہ آپؐ نے صرف دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کیا بلکہ بالفعل ایک انقلاب بھی برپا کیا' پہلے سے موجود نظام کو جڑ بنیاد سے تبدیل کر دیا۔

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

آپؐ نے صرف مبلّغ' صرف معلّم و مدرس اور صرف مربّی پیدا نہیں کئے' بلکہ ان سب کو مجاہد بھی بنایا ہے۔ اور اس جہاد کا ہدف اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنا قرار دیا کہ وقت آنے پر اس کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش کرو۔

میرے اصل مخاطب کون لوگ ہیں؟

میں یہ وضاحت بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ میری آج کی گفتگو کے مخاطب کون ہیں اور کون نہیں۔ معین کر لینا چاہئے کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں' کیونکہ بھینس کے آگے بین بجانا وقت کا ضیاع ہے۔

پاکستان میں اب ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے' بلکہ کبھی بھی کمی نہیں رہی ہے جو سمجھتے ہیں کہ پاکستان غلط بنا ہے' اور اگرچہ وہ واضح الفاظ میں نہیں کہتے' لیکن اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ ان کے نزدیک اس کو ختم ہو جانا چاہئے اور اس طرح قیامِ پاکستان کی غلطی کا ازالہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ جی ایم سید نے اس پر پوری کتاب لکھی کہ اب پاکستان کو ختم کر دینا چاہئے۔ اور یہ کتاب اس ملک میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلائی گئی۔ اور میں آپ کو بتا دوں کہ پاکستان کے تینوں چھوٹے صوبوں میں یہ فکر بعض مذہبی حلقوں میں بھی موجود ہے اور سیاسی حلقوں میں بھی۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا بننا تو درست تھا لیکن اب یہ

اس درجے بگڑ گیا ہے کہ اصلاحِ احوال کا کوئی امکان ہی باقی نہیں' لہٰذا خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو' بلکہ آنے والے وقت کا انتظار کرو۔

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اور یہ دوسری قسم کے لوگ اصلاحِ احوال کی کوشش کرنے والے لوگوں سے بھی یہی کہتے ہیں کہ تم کیوں دیواروں کے ساتھ سر ٹکرا رہے ہو؟ گویا "لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا" (الاعراف : ۶۴) تمہاری اس تبلیغ و تلقین سے' سعی و کوشش سے' محنت اور جدوجہد سے' واویلا کرنے اور نالہ و شیون سے کچھ حاصل نہیں ہے' لہٰذا لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ یہ طرزِ فکر رکھنے والے لوگ بھی میرے مخاطب نہیں ہیں۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا بننا بھی درست تھا اور اس کا قائم رہنا بھی ضروری ہے۔ یہاں اگر بگاڑ پیدا ہوا ہے تو ہماری اپنی غلطیوں سے ہوا ہے' ہمیں آخر دم تک اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف کی آیت ۶۴ ہی میں مذکورہ بالا الفاظ کے بعد اصلاح کی کوشش کرنے والوں کا جواب بھی نقل ہوا ہے۔ انہوں نے کہا "مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ" یعنی ہم یہ ساری کوشش اس لئے کر رہے ہیں تاکہ "اپنے رب کے حضور معذرت تو پیش کر سکیں" کہ پروردگار ہم تو آخر دم تک اسی کام کے لئے کوشاں رہے' ہم نے دنیا نہیں بنائی' جائیدادیں نہیں بنائیں' اپنے پروفیشن اور کیریئر نہیں چمکائے' بلکہ ہم اس راہ میں محنت کرتے رہے' ہماری سعی وجہد کا نتیجہ تو تیرے ہاتھ تھا۔ "اور شاید کہ ان میں تقویٰ پیدا ہو جائے"۔ کیا پتہ کہ یہ جاگ ہی جائیں۔ تم یقینی طور پر کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ ہلاک ہو کر ہی رہیں گے۔ کیا خبر کہ انہیں ہوش آ ہی جائے۔ ایک معالج آخری سانس تک مریض کا علاج کرتا ہے کہ کیا عجب کوئی دوا کارگر ہو جائے۔ میرا خطاب ان تیسری قسم کے لوگوں سے ہے۔

چوتھے نمبر پر وہ لوگ ہیں کہ جو یہ بھی سمجھتے ہیں کہ پاکستان ٹھیک بنا ہے اور اس بارے میں پُر امید بھی ہیں کہ جلد یا بدیر حالات صحیح ہو جائیں گے۔ اب ان میں پھر مختلف قسم کے

لوگ ہیں۔ چنانچہ کچھ تو خوابوں کی بنا پر دعوے کرتے ہیں' کچھ لوگوں کو بعض ملنگ قسم کے لوگوں کی پیشینگوئیوں پر یقین ہے۔ اور کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی پیشین گوئیوں کے حوالے سے پُر امید ہیں ع میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے! اس ضمن میں ہم نے "نویدِ خلافت" نامی چھوٹا سا کتابچہ مفت تقسیم کے لئے شائع کیا ہے' جس میں ہم نے آیات اور احادیث کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ یہ خطۂ زمین اسلام کا گہوارہ بنے گا اور عالمی خلافتِ اسلامیہ کا احیاء یہیں سے ہو گا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ سوچ رکھنے والے لوگ بھی یقینی طور پر میرے مخاطب ہیں کہ وہ تجزیہ کر کے سوچیں کہ ہمارے بگاڑ کا اصل سبب کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟ پھر اس کے لئے وہ اپنی امکانی حد تک کوشش بھی کریں۔ یہ اگر نہیں کریں گے تو پھر اس کا کچھ حاصل نہیں۔

پانچواں طبقہ وہ ہے جو میرے نزدیک ایک خالص دینی فکر کا حامل ہے۔ اور وہ فکر یہ ہے کہ حالات اور سیاست سے قطع نظر' خواہ پاکستان بنتا یا نہ بنتا' اور رہے یا نہ رہے' یہ ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہمیں دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا ہے۔ اگر بالفرض پاکستان نہ بنتا تو کیا یہ جدوجہد ہم پر فرض نہیں تھی؟ کیا پاکستان بننے سے پہلے ہم امتِ مسلمہ کا حصہ نہیں تھے اور ہم پر شہادت علی الناس کی ذمہ داری نہیں تھی؟ کیا ہم "اَقِیْمُوا الدِّیْنَ" کے قرآنی حکم کے مخاطب نہیں تھے؟ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان کے قیام نے ہماری ذمہ داری کو ہزار گنا بڑھا دیا ہے' لیکن اگر یہ نہ بھی بنتا تب بھی "اقامتِ دین" ہماری دینی ذمہ داری تو تھی۔ اسی طرح پاکستان رہے یا نہ رہے' یہ دینی ذمہ داری تو پھر بھی برقرار رہے گی۔ میرے نزدیک یہ صحیح ترین فکر ہے اور میں خود اسی پر عمل پیرا ہوں۔ میں نے جو پانچ طبقات گنوائے ہیں ان میں سے پہلے دو سے تو مجھے اس وقت کوئی بات نہیں کرنی ہے' میرے مخاطب مؤخر الذکر تین طبقات ہیں۔ ان لوگوں کے غور و فکر کے لئے اب میں چند اہم عوامل جن سے ہمیں اس وقت سابقہ ہے' سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

ایک جانب نیو ورلڈ آرڈر کے پردے میں یہودیوں کی عالمی بالادستی کا سیلاب ہے'

جس کا فوری ٹارگٹ ایران' پاکستانی اور افغانستان ہیں۔

دوسری جانب مسلمانانِ کشمیر کا جہادِ حریت اب ان حدوں کو چھو چکا ہے جس کے نتیجے میں بھارت پاکستان کے خلاف ننگی اور کھلی جارحیت کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ اور اگر ہمارے پاس ایٹمی ڈیٹرنٹ نہ ہوتا' تو وہ کب کا کر چکا ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ ہماری ایٹمی صلاحیت ان سے دس گنا زیادہ ہے' اگر ہمارا دسواں حصہ تباہ ہو گا تو یہ پورا ملک تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا بھارتی جارحیت کو خارج از امکان نہ سمجھئے۔ انہوں نے اپنی میزائل ٹیکنالوجی پر جو ارب ہا ارب روپے خرچ کئے ہیں' وہ کاہے کے لئے کئے ہیں؟ بنیا تو ایک پیسہ بھی کسی مقصد اور منفعت کے بغیر خرچ کرنے کو تیار نہیں ہوتا!

تیسری جانب مسلح دہشت گردی اور کھلی بغاوت کی صورت میں نفاذِ اسلام سے روگردانی کی سزا یعنی نفاقِ باہمی کا عذاب کراچی کی بندرگاہ سے ملک میں داخل ہو چکا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم اپنے ہاتھوں عذابِ خداوندی کو درآمد کر چکے ہیں۔ کہا گیا تھا کہ ہم نے دہشت گردی کی کمر توڑ دی ہے' لیکن ابھی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شاید ایک آدھ انگلی ہی کٹ سکی ہو' کمر ٹوٹنے کا تو کوئی سوال نہیں۔

چوتھی جانب ملک میں معاشرتی بدامنی اور آوارگی' سیاسی خلفشار اور محاذ آرائی اور مالیاتی لوٹ کھسوٹ' اور بندر بانٹ آخری حدوں کو پہنچ چکی ہے' اس کی بھی اگر میں تفصیل بیان کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری! اِن موضوعات پر تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ یہ چیزیں بارہا میری گفتگوؤں کا موضوع بن چکی ہیں' اِس وقت صرف گنوا رہا ہوں۔ لیکن آج کی گفتگو کے اعتبار سے اہم ترین اور ان سب پر مستزاد مذہبی جماعتوں کا باہمی نفاق ہے جو روز بروز تقسیم در تقسیم کی صورت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ جمعیت علمائے اسلام' جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت اہلحدیث کے کئی کئی دھڑے وجود میں آ چکے ہیں۔ اب جماعت اسلامی بھی دھڑوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ اس تقسیم در تقسیم کے عمل میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے اور سینے کے چاک کو رفو کرنے کی کوئی تدبیر کسی طرف سے نہیں کی جا رہی' بلکہ اسے مزید پھاڑنے کا عمل دن بدن شدت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔

موجودہ صورتحال کا اہم ترین سبب

ہمارے لئے غور و فکر کا مقام یہ ہے کہ اس صورتحال کا سبب کیا ہے؟ اس پوری صورتحال کے دوسرے داخلی اور خارجی اسباب بھی ہیں' جو اپنی جگہ نہایت اہم ہیں' لیکن اہم ترین سبب میرے نزدیک ہمارا اپنی اصل منزل سے انحراف اور اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدے سے روگردانی ہے۔ دوسرے اسباب اپنی جگہ پر اہم ہیں' مثلاً اس ضمن میں مسلم لیگ کا کردار زیر بحث آ سکتا ہے' اس پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے کہ ہماری آرمی کے اندر جو امنگیں پیدا ہو گئیں ان کا کیا نتیجہ نکلا' ہمارے ہاں کے جاگیرداروں کا جو ایک مزاج تھا اس نے کیا گل کھلائے۔ ہماری بیوروکریسی کو بھی زیر تنقید لایا جا سکتا ہے کہ وہ انگریز کی تربیت یافتہ تھی' اور ذہناً و ثقافتاً' خالصتاً مغربی تھی' صرف نام کے مسلمان لوگ تھے۔ یہ سارے سبب آپ گنتے چلے جایئے' لیکن میرے نزدیک اہم ترین سبب اصل منزل سے انحراف ہے۔ ہماری منزل تھی نفاذِ اسلام' پاکستان میں نظامِ اسلام کا قیام' پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ! لیکن ہم نے اپنی منزل سے انحراف کیا۔ اس انحراف میں کس کا کتنا حصہ ہے' اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ میں نے پچھلے سال ۱۶ دسمبر کو "سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب و عوامل" کے موضوع پر اپنی تقریر میں (جو جنوری ۹۵ء کے میثاق میں شائع ہو گئی تھی) پورا کچا چٹھا بیان کر دیا تھا کہ ؏ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے! ہم نے پہلے دن سے ہی اس ملک میں سیکولرازم کی بنیاد قائم کی' چنانچہ اس کا پہلا وزیر قانون ایک ہندو کو اور پہلا وزیر خارجہ ایک قادیانی کو مقرر کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اسلام' ایمان اور عقائد کا یہاں کوئی اعتبار ہی نہیں۔ اپنے اس طرز عمل سے ہم نے گویا پوری تحریکِ پاکستان کی نفی کر دی ؏ میں باز آیا محبت سے' اٹھا لو پاندان اپنا! لہٰذا بعد میں آنے والوں کو کیا الزام دیا جائے جبکہ روزِ اول ہی معاملہ اس شعر کے مصداق تھا۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج!

منزل سے اس انحراف کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں ہم نے اللہ تعالیٰ سے

ایک خاص وعدہ کیا تھا کہ اے اللہ! ہمیں ہندو اور انگریز کی غلامی سے نجات دلا، ہم تیرے عطا کردہ خطۂ زمین میں تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ اور اِس وعدہ خلافی کی بد ترین سزا ہمیں نفاق کی صورت میں مل چکی ہے۔ میں کئی مرتبہ سورۃ التوبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ کے حوالے سے یہ مضمون بیان کرچکا ہوں۔

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾

"اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے ایک عہد کیا تھا کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے نواز دے (غنی کردے) تو ہم خوب صدقہ و خیرات کیا کریں گے اور نیک بن جائیں گے۔"

﴿ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾

"پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا تو انہوں نے بخل سے کام لیا اور پیٹھ موڑلی اور اعراض کیا۔"

﴿ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝﴾

"پس اللہ نے سزا کے طور پر ان کے دلوں میں نفاق پیدا کردیا اس روز تک جب وہ اس سے ملاقات کریں گے، بسبب اس وعدہ خلافی کے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی اور بسبب اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے"

ان آیات میں تو چند لوگوں کے حوالے سے اللہ کے عذاب کا ذکر ہے کہ انہیں ان کی بد عہدی کی سزا نفاق کی صورت میں ملی، جبکہ یہاں تو پوری قوم کا یہی معاملہ ہے۔ دس کروڑ کی قوم نے اللہ سے ایک وعدہ کیا اور پھر اس کی خلاف ورزی کی۔ لہٰذا ہم قومی سطح پر نفاق کا شکار ہوگئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قومی سطح پر ہمارے ہاں دونوں قسم کے نفاق موجود ہیں، منافقت بھی اور نفاقِ باہمی بھی۔ جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ دجّال کے ماتھے پر لکھا ہوگا "ک ف ر" (کفر) اسی طرح ہمارے قومی ماتھے پر "نفاق" کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ ایک نفاقِ

باہمی ہے کہ پوری قوم اب قومیتوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ لسانی قومیتیں ‘نسلی قومیتیں‘ ثقافتی دھڑے بندیاں‘ پھر سب سے بڑھ کر صوبہ پرستی اور ان سب پر مستزاد مذہبی فرقہ واریت‘ یہ سب نفاقِ باہمی کے عملی مظاہر ہیں۔ اس کے علاوہ نفاقِ عملی کا بھی ہم پر پورے طور پر تسلط ہو چکا ہے اور یہ چیز اس قوم کی پہچان بن چکی ہے‘ چنانچہ جھوٹ‘ وعدہ خلافی اور خیانت کا دور دورہ ہے۔ جو جتنا بڑا ہے وہ اتنا ہی بڑا جھوٹا‘ وعدہ خلاف اور خائن ہے۔ اِلاّ ماشاء اللہ‘ استثناء ات تو قاعدے کلیے کو ثابت کرتی ہیں۔ (Exception proves the rule) چنانچہ آپ کو استثناء ات کے طور پر افراد تو مل جائیں گے‘ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پوری قوم مجموعی طور پر نفاق میں مبتلا ہے۔ تو یہ ہے ہمارے بگاڑ اور فساد کا اصل سبب جس کے دو پہلو میں نے آپ کے سامنے رکھے۔

فوری تدابیر اور مستقل علاج

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتحال کا علاج کیا ہے؟ اس کا اصل علاج تو اپنی منزل کی طرف پیش قدمی یعنی نظامِ اسلامی کا قیام ہے‘ لیکن فوری اور Palliative علاج کے طور پر بھی کچھ اقدامات ضروری ہیں۔ مثلاً ایک خاص مسئلے کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ پاکستان کے چھوٹے صوبے بنائے جائیں۔ پورے ملک کو لگ بھگ ایک ایک کروڑ کی آبادی کی مناسبت سے کم از کم بارہ صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے۔ لوگ محسوس کریں کہ ہمارے معاملات ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ نئی صوبائی تقسیم میں لسانی اور ثقافتی عوامل کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ پاکستان کے ماحول کے اعتبار سے یہ ایک "کلمۂ کفر" ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ میں یہ بات بہت پہلے سے ایک تسلسل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ ۱۹۹۱ء میں میں نے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا تو اس میں بھی یہ بات ایک نکتے کی حیثیت سے شامل کی تھی۔ مختلف حلقوں کی طرف سے اس بات کی تائید بھی سامنے آئی ہے۔ چنانچہ صوبوں کے بارے میں ایئر مارشل (ر) اصغر خان صاحب کا موقف بھی یہی ہے اور آج کے "News" میں ان کا ایک مضمون بھی شائع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں گزشتہ دنوں دو نہایت قیمتی مضامین میرے مطالعے میں آئے ہیں۔

ان میں سے ایک اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ جماعت اسلامی کے حلقے کے انگریزی جریدے "The Universal Message" میں شائع ہوا ہے۔ یہ جریدہ ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے اگست ۹۵ء کے شمارے میں محمد علی شہاب صاحب کا ایک مضمون "Small Provinces or....?" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے میرا نام لے کر میرے موقف کی تائید کی ہے کہ اگر ملک کو بچانا ہے تو پورے پاکستان میں چھوٹے صوبے بنائے جائیں۔ دوسرا مضمون ایک غیر مسلم صحافی اور سیاست دان مسٹر ایم پی بھنڈارہ (سابق اقلیتی رکن قومی اسمبلی) کا ہے جو روزنامہ "ڈان" میں چھپا ہے۔ میرے نزدیک سندھ کی صورتحال کا اس قدر اختصار اور جامعیت کے ساتھ مبنی بر حقیقت تجزیہ 'بشمول میرے' شاید کسی اور نے نہ کیا ہو۔ حالانکہ اس میں اکثر و بیشتر چیزیں وہی ہیں جو میں آج سے آٹھ سال پہلے "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" نامی کتاب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ لیکن اس مضمون میں آپ کو یہ سارا تجزیہ اختصار کے ساتھ اور ایک خالص سیکولر نقطۂ نظر سے مل جائے گا۔ ہم نے ان دونوں انگریزی مضامین کو ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا ہے' آپ میں سے انگریزی دان حضرات اس کتابچے کو حاصل کر کے ضرور پڑھیں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ آپ کے ملک میں کیا ہو رہا ہے' آپ کے مسائل ہیں کیا؟ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا' ان اقدامات کی حیثیت "Palliative Treatment" کی ہے' نہ کہ مستقل علاج کی۔ کسی کو ۱۰۶ درجے کا بخار ہو جائے تو بخار کو فوری طور پر اتارنے کے لئے آپ جو تدابیر کرتے ہیں اس سے بخار تو اُتر جاتا ہے اور مریض کو اُس وقت بحرانی کیفیت سے نجات مل جاتی ہے' لیکن اسے علاج نہیں کہتے۔ ہمیں جو مرض بحیثیتِ قوم لاحق ہے اس کا علاج (Curative Treatment) صرف ایک ہے ع علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی! یعنی یہ پوری قوم توبہ کرے اور دوبارہ اپنی منزل کی طرف رخ کرے ع کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو! اور یہاں پر نفاذِ اسلام کے لئے اپنی پوری توجہات کو مرکوز کر دے۔ اس ضمن میں زیادہ بڑی ذمہ داری دینی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے۔ اِس وقت میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا' اس لئے کہ اس موضوع پر میری کتاب "استحکامِ

پاکستان" پورے دستاویزی حوالوں اور دلائل کے ساتھ موجود ہے۔ میرے نزدیک قیامِ پاکستان ایک معجزہ تھا اور یہ ملک صرف اس لئے وجود میں آیا کہ ہم نے اللہ سے ایک عہد کیا تھا اور سارا خلفشار اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اس عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔ اب علاج صرف یہی ہے کہ اس وعدے کو پورا کیا جائے۔

نظامِ اسلام قائم نہ ہونے کا اہم ترین سبب

مملکتِ خداداد پاکستان میں دین اسلام کا قیام و نفاذ نہ ہونے کے بھی بہت سے اسباب ہیں، لیکن ان میں بھی اہم ترین ایک ہے، اور وہی میری آج کی گفتگو کے لئے مرکزی نکتہ ہے۔ اور وہ ہے "دینی جماعتوں کی غلط حکمت عملی" جو میرے نزدیک سب سے بڑا سبب ہے۔ دینی جماعتوں کی غلط حکمت عملی یہ ہے کہ انہوں نے الیکشن کا راستہ اختیار کر کے اسلام کو ایک سیاسی نعرے کی حیثیت دے دی۔ اس طرح یہ ایک پارٹی ایشو بن کر متنازع فیہ مسئلہ بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام پوری قوم کی پشت پناہی سے محروم ہو کر کچھ سیاسی جماعتوں کا پشت پناہ بن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر مختلف مذہبی جماعتوں کے انتخابی میدان میں اترنے نے اس جلتی پر تیل کا کام کیا اور مختلف برانڈ کے اسلام منظرعام پر آ گئے۔ اس طرح مذہبی جماعتیں دین میں تفریق کا باعث بھی بنیں۔ سب سے پہلے جماعت اسلامی میدانِ سیاست میں کودی۔ ۱۹۵۱ء کے پنجاب الیکشن میں اسے چالیس سیٹوں کی توقع تھی لیکن ایک بھی نہیں مل سکی اور وہ چاروں شانے چت ہو گئی۔ اس کے بعد نورانی میاں نے سوچا کہ

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

ہم تو سوادِ اعظم کے نمائندے ہیں۔ وہ انتخابی میدان میں کودے تو انہیں کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ کراچی، حیدر آباد اور بعض دوسری جگھوں پر ان کے نمائندے کامیاب بھی ہوئے۔ جمعیت علماء اسلام کا معاملہ یہ تھا کہ اپنے تاریخی پس منظر کے حوالے سے وہ کچھ عرصے منقار زیرِ پر رہے، اس لئے کہ تقسیم سے قبل وہ پاکستان کے مخالف تھے اور ابتدا میں انہیں یہاں بولنے کا حق تھا ہی نہیں۔ پھر انہوں نے سوچا کہ اس جولانگاہ میں ہمیں بھی قسمت آزمائی

کرنی چاہیئے' چنانچہ وہ بھی اس میں کود پڑے۔ رہ گئے اہلحدیث تو انہوں نے سوچا کہ ہماری بھی کچھ pockets موجود ہیں۔ اگر زیادہ نہیں تو ہمارے ایک دو آدمی تو اسمبلی میں پہنچ ہی جائیں گے' اور بعض اوقات کسی نازک لمحے پر ایک آدمی بھی بڑا قیمتی ثابت ہوتا ہے' جب ایک ووٹ کے فرق پر ہی سارا معاملہ موقوف ہوتا ہے۔ ایک موقع پر صدر ایوب خان نے مفتی محمود صاحب کے ایک ووٹ سے دستور میں ترمیم کی تھی۔ اور کہا گیا تھا کہ مفتی صاحب کو اس تعاون کے عوض دس لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ اندازہ لگایئے 'اُس دور کے دس لاکھ آج کے دس کروڑ سے کم نہیں ہیں۔ مفتی صاحب نے اس الزام کی تردید نہیں کی تھی' البتہ یہ کہا تھا کہ ہاں' میرے مدرسے کو دیئے ہیں۔ یہ کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے جیسے بعد میں ایک ایسے ہی موقع پر کسی مذہبی سیاسی جماعت کے امیدوار نے یہ کہا تھا کہ ہم بِکے نہیں' ہم نے سودے بازی کی ہے۔ میرے نزدیک اس چیز نے اسلام کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے۔ دراصل یہ نتیجہ ہے اس غلط حکمتِ عملی کا کہ مذہبی جماعتوں نے انتخابی سیاست کو اپنا میدانِ کار بنایا اور ان کے نفاقِ باہمی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ عوام کے سامنے مختلف برانڈ کے اسلام آنے لگے۔ بریلوی مکتب فکر' دیوبندی مکتب فکر' اہلحدیث مکتب فکر اور جماعت اسلامی کے اپنے اپنے "اسلام" تھے' ان کے علاوہ ایک لبرل اسلام بھی تھا۔ اس طرح پانچ مختلف اسلام وجود میں آ گئے اور اسلام ایک پارٹی ایشو اور انتخابی نعرہ بن کر رہ گیا۔ اگر ایک ہی جماعت میدان میں اتری ہوتی تو شاید کچھ نہ کچھ حاصل کر بیٹھتی۔

اصلاحِ احوال کی صورت

اب اصلاح کی طرف آیئے۔ اس ضمن میں پہلا قدم کیا ہو؟ میں بھی اگر محض اتحاد کا وعظ کہہ دوں تو اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا' بہت سے لوگ مجھ سے اچھا وعظ کہہ سکتے ہیں۔ آیات واحادیث کے حوالے سے اتحاد کی برکات پر وعظ کہنے والوں کی ہمارے ہاں کمی نہیں ہے' لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ اتحاد کیسے ہو؟ بلی کے گلے میں گھنٹی کیسے باندھی جائے اور اسے باندھے کون؟ یہ ہفت خواں کیسے طے ہو؟ اس کے لئے کچھ باتیں آپ کے گوش گزار کرنی ہیں۔ ان میں تین باتیں تو وعظ کی نوعیت کی ہیں جن پر قدم بقدم عمل پیرا ہونے کی

ضرورت ہے۔

اولاً---- محاذ آرائی سے گریز ہو۔

ثانیاً---- ہم خیال جماعتیں جو تاریخی اور نظریاتی اعتبار سے کچھ قریب ہوں' ان کا کوئی باہمی تعاون شروع ہو جائے۔

ثالثاً---- سب کی سب اگر متّحد نہ ہو سکیں تو بھی تقسیم در تقسیم کے عمل کو کچھ تو پسپا کریں اور ان کے مابین اِدغام نہ سہی کوئی وفاق کی شکل ہی پیدا ہو جائے۔

اتحادِ باہمی کے لئے قرآن حکیم کا حکم یہ ہے کہ : "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" (آل عمران : ۱۰۳) یعنی "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور باہم متفرق نہ ہو جاؤ"۔ میں ان الفاظِ مبارکہ میں سے ایک لفظ حَبْل (رسی) مستعار لے رہا ہوں۔ آپ اس رسی کی تشبیہ کو اپنے ذہن میں رکھئے۔ ایک موٹی رسی کئی لڑیوں سے بٹی ہوئی ہوتی ہے اور ہر لڑی پھر بہت سے دھاگوں سے بنی ہوتی ہے۔ ایک رسی میں بالعموم چار بڑی بڑی لڑیاں ہوتی ہیں اور ہر لڑی متعدد دھاگوں سے بٹ کر بنائی گئی ہوتی ہے۔ اب اگر اس رسی کے بل کھول دیئے جائیں تو منطقی طور پر یہ صورت سامنے آئے گی کہ پہلے چار لڑیاں علیحدہ ہوں گی' پھر ہر لڑی کے دھاگے علیحدہ ہونا شروع ہو جائیں گے' چنانچہ وہ ایک رسی کی بجائے 4 x 4 = 16 دھاگے ہوں گے۔ تو عقلی اور منطقی اعتبار سے ان دھاگوں کو دوبارہ رسی بنانے کا عمل کہاں سے شروع ہو گا؟ یہ اوپر سے نہیں' بلکہ نیچے سے شروع ہو گا' پہلے دھاگوں کو دوبارہ بٹ کر لڑیاں بنایئے اور پھر ان لڑیوں کو بٹ کر رسی بنایئے۔ اس کی عملی شکل یہی ہے' اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

ہماری مذہبی جماعتوں کا تاریخی و نظریاتی پس منظر

لیکن اس میں جو تقسیم ہے' کہ لڑیاں کونسی ہیں اور دھاگے کون سے ہیں' اس کو دو اعتبارات سے' یعنی تاریخی اور نظریاتی پس منظر کے حوالے سے جان لیجئے۔ اِس ملک میں دینی جماعتوں کا پہلا پس منظر یہ ہے کہ تقریباً ایک سو سال پہلے تک پورے ہندوستان میں' سوائے اس کے کہ مالابار کے ساحل پر کچھ شافعی لوگ آباد تھے' باقی تمام مسلمان کٹر حنفی

تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام مسلمان تصوف کے ساتھ گہرا ربط بھی رکھتے تھے اور کسی نہ کسی سلسلۂ طریقت سے علامتی یا حقیقی اور عملی وابستگی لازم سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ آپ آج سے سو سال پہلے کی کوئی کتاب دیکھ لیجئے تو اس کے مصنف کے مسلک اور مشرب کے بارے میں صراحت کچھ اس طور سے درج ہو گی کہ : "حنفی مسلکاً و قادری مشرباً" وغیرہ۔ تب ان دو صفات کے بغیر آدمی کا تعارف مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مشرب میں چاروں مشہور سلاسل یعنی قادری، چشتی، سہروردی اور نقشبندی یہاں رائج تھے۔ لیکن پچھلے سو، سوا سو سال میں اس رجحان میں تبدیلی آئی، اس لئے کہ دار العلوم دیوبند ایک زبردست تحریک بن کر ابھرا اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے بانیوں کا جوش و خروش اور خلوص و اخلاص مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان حنفی اور صوفی مزاج مسلمانوں میں دیوبندی اور غیر دیوبندی کی تقسیم ہو گئی۔ غیر دیوبندیوں میں فرنگی محلی بھی ہیں، فضلِ حق خیر آبادی والے مکتب فکر کے حضرات بھی ہیں، بدایونی بھی ہیں، نظامی بھی ہیں اور نہ معلوم کون کون سے ہیں۔ جبکہ دیوبند اپنی جگہ پر اتنا بڑا بھاری پتھر بن گیا کہ وہ ان سب کو بیلنس کرنے کے لئے ترازو کے دوسرے پلڑے میں تنہا ہی کافی تھا۔ پھر ہوتے ہوتے یہ تقسیم دیوبندی اور غیر دیوبندی کے بجائے دیوبندی اور بریلوی کی ہو گئی، اس لئے کہ اس میں جو بہت فعال عنصر پیدا ہوا ہے، وہ مولانا احمد رضا خان بریلوی کی شخصیت ہے۔ تو یہ ہے مذہبی اعتبار سے ہمارا ایک تاریخی پس منظر۔

تیسرے یہ کہ اسی دور میں اہل حدیث مکتب فکر بھی کچھ نمایاں ہوا۔ اگرچہ محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کی تحریک کے اثرات دو سو سال پہلے ہی سے شروع ہو گئے تھے لیکن اس صدی کے اندر رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوا۔ اور خلیج میں تیل کے برآمد ہونے کے بعد انہیں جو مالی تعاون حاصل ہوا، وہ کسی کو مل ہی نہیں سکتا۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنی عددی قوت کے مقابلے میں کئی گنا مؤثر ہو گئے ہیں۔ لیکن میں اس وقت اہل حدیث حضرات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے باقی دونوں کی بات کر رہا ہوں، یعنی دیوبندی اور بریلوی جو "سوادِ اعظم" ہیں۔ ان دونوں میں تین چیزیں مشترک ہیں : i) دیوبندی ہوں یا بریلوی، دونوں حنفی ہیں، ان کی فقہ ایک ہے، ii) دونوں تصوف کے قائل ہیں اور iii) دونوں کے

عقائد کی امہات الکتب ایک ہیں۔ ان کے مابین صرف چند مسئلوں میں اختلاف ہے۔ مثلاً آیا درود و سلام پڑھتے ہوئے کھڑے ہو جانا چاہئے یا نہیں؟ "یا رسول اللہ" کہنا چاہئے یا نہیں؟ نذر و نیاز کا معاملہ صحیح ہے یا نہیں؟ وغیرہ' اور آپ سے عرض کر دوں کہ ان مسائل کو بھی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی" نے اپنی کتاب "فیصلہ ہفت مسئلہ" میں اس طرح طے کر دیا ہے کہ ان کے اندر دیوبندی اور بریلوی دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ دیوبندی بھی کسی نہ کسی درجے میں ان ساری باتوں کو مانتے ہیں جو بریلوی کہتے ہیں۔ حاجی صاحب بھی کھڑے ہو کر درود پڑھنے کو قابل اعتراض نہیں سمجھتے۔ اور حاجی صاحب" ان تمام دیوبندیوں کے پیر تھے۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی" کے بھی مرشد تھے اور مولانا رشید احمد گنگوہی" کے بھی۔ وہ صابری سلسلے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ تو اب ان کا صرف مساجد اور مدارس کا نظام الگ الگ ہے' ورنہ ان کے مابین سرے سے کوئی فرق نہیں۔ وہی حنفیت اور وہی عقائد دونوں جگہ ہیں۔

یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ شخصیات کا تصادم صرف پچھلی صدی میں شروع ہوا ہے' جب شاہ اسماعیل شہید" اور مولانا فضل حق خیر آبادی" کے مابین خالص علمی مسائل پر مناظرے شروع ہوئے۔ ان مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنسی بھی آتی ہے اور رنج بھی ہوتا ہے کہ ہمارے اکابرِ امت کن چیزوں میں جھگڑ رہے تھے!! اللہ تعالیٰ کی قدرت کے حوالے سے یہ مسائل زیر بحث تھے کہ اللہ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کے جواب میں "ہاں" کہئے تو یہ اللہ کی شان میں گستاخی ہے اور اگر "نہیں" کہئے تو اللہ ہر چیز پر قادر نہیں رہا۔ اب اس پر منطق کے گھوڑے دوڑاتے رہئے۔ دوسرا مسئلہ "امتناعِ نظیر" کا تھا کہ خود اللہ تعالیٰ بھی کوئی اور "محمدؐ" پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ بے مثل نہ رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد ﷺ کی نظیر ہو سکتی ہے اور یہ حضورؐ کی شان میں گستاخی ہو گئی۔ اور اگر یہ کہیں کہ اللہ کوئی اور محمدؐ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے تو اللہ کی شان میں گستاخی ہو گئی۔ میں یہ مرثیہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ حقائق کو سمجھیں۔ ہمارے بزرگ ان مسئلوں پر اُس وقت جھگڑ رہے تھے جب انگریز بنگال سے داخل ہو کر ہندوستان کو فتح کر رہا تھا۔ بعینہٖ یہی بات ایک ہزار برس قبل اُس وقت ہوئی تھی

جب سلطان محمد فاتح کی فوجیں قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے کھڑی تھیں (جواب استنبول یا اسلام بول کہلاتا ہے) تو وہاں کے سب سے بڑے گرجا گھر ایاصوفیہ میں (جسے بعد میں مسلمانوں نے مسجد بنایا اور پھر اتاترک نے اسے ایک عجائب گھر کی شکل دے دی) عیسائی پادری ان مسائل پر مناظرے کر رہے تھے کہ ایک سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے آسکتے ہیں؟ حضرت مسیح علیہ السلام نے جو آخری کھانا تناول کیا تھا اس میں جو روٹی کھائی وہ خمیری تھی یا فطیری؟ اور یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد بھی حضرت مریم باکرہ رہ گئیں یا نہیں رہیں؟ پچھلی صدی میں شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیر آبادیؒ کے مابین شخصیتوں کا ٹکراؤ ہوا تو اس صدی میں مولانا احمد رضا خان بریلوی صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے درمیان سارا معرکہ برپا ہوا۔ اور اِس وقت دیوبندیوں اور بریلویوں میں جو بھی تندی اور تلخی ہے وہ ان دو حضرات کی وجہ سے ہے۔ میرے نزدیک یہ صرف "Personality Conflict" (شخصیات کا نزاع) ہے' اس کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس حوالے سے اہل حدیث کے بارے میں کچھ عرض یہاں میرے پیش نظر نہیں ہے' ان کا اپنا ایک فقہی مسلک ہے۔

اب آیئے اس موضوع پر کہ' سیاسی اعتبار سے ہماری مذہبی جماعتوں کا پس منظر کیا ہے! تقسیمِ ہند سے قبل ایک مذہبی جماعتیں وہ تھیں جو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کو صرف جائز اور ضروری ہی نہیں' لازم اور فرض سمجھتی تھیں' جس سے متحدہ قومیت کا تصور ابھرا کہ "آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" یہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا قول ہے۔ یعنی آج کل دنیا میں قومیت کا تشخّص ملک کے حوالے سے ہوتا ہے۔ یہ ہندوستانی ہے' یہ ایرانی ہے' یہ امریکی ہے' قومی تشخّص مذہب کے حوالے سے نہیں ہوا کرتا۔ ہم جب ہندوستانی ہیں تو مسلمان بھی ہندوستانی ہے اور ہندو بھی ہندوستانی ہے۔ یہ موقف جمعیت علمائے ہند اور خاص طور پر اس میں مولانا حسین احمد مدنی کے گروپ کا تھا جو پورے ہندوستان میں مذہبی قیادت کے حوالے سے بہت مضبوط اور طاقتور تھا۔ ان کے ہم خیال علماء' خطباء' ائمۂ مدارس' معلمین اور مدرسین ہندوستان بھر میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور جماعت مجلس احرار اسلام تھی جس کا

سیاسی موقف بھی بالکل وہی تھا جو جمعیت علماء ہند کا تھا۔ دوسری جانب بریلوی مکتب فکر کے علماء اور مشائخ تھے جن کی اکثریت کا موقف جمعیت علماء ہند کے برعکس تھا۔ یعنی پہلے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو طے کرنا چاہئے، پھر انگریز سے چھٹکارا پانے کی بات ہوگی، ورنہ یہاں کے ہندو ہمیں دبالیں گے اور ہمارا استحصال کریں گے۔ گویا اس ضمن میں ان کا موقف وہی تھا جو مسلم لیگ کا تھا۔ اس حلقے نے متحدہ قومیت کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے حق میں آواز اٹھائی۔ اسی کی دہائی ہماری سلہری صاحب ہمیشہ دیتے رہتے ہیں کہ پاکستان مسلم قومیت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ اسی موقف کی بنا پر دیوبندی علماء میں سے بھی ایک جماعت نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا، یعنی تھانوی حلقے کے علماء نے جن میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ شامل تھے۔ مولانا تھانویؒ خود بھی مسلم لیگ کے موقف کے موید تھے۔ باقی زیادہ تر بریلوی علماء و مشائخ مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔

ان کے علاوہ ایک تیسرا مکتبِ فکر بھی تھا جسے ایک اعتبار سے آپ بین بین بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک مرکّب فکر کا حامل بھی۔ اس حلقے نے جداگانہ قومیت کا پُرزور اثبات کیا اور متحدہ قومیت کی زبردست نفی کی۔ اس اعتبار سے گویا تحریکِ مسلم لیگ کی تائید کی اور اس کی تقویت کا ذریعہ بنے۔ لیکن انہوں نے مسلم لیگ سے اپنا راستہ اس لئے جدا کر لیا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ خالص قومی تحریک اور قومی جدوجہد سے اسلام قائم نہیں ہو سکتا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہماری منزل اسلام قائم کرنا ہے، صرف ایک آزاد مسلمان ملک حاصل کرنا نہیں ہے، کیونکہ دنیا میں اور بھی بیسیوں آزاد مسلمان ممالک موجود ہیں لیکن کہیں بھی اسلام کا نظام قائم نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی کوئی اور مسلمان ملک وجود میں آ جائے تو کیا اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟۔ یہاں سے ان کا راستہ تحریک مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے الگ ہو گیا۔ ابتداء میں، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، یہ صرف اختلاف تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس میں مخالفت کا رنگ بھی پیدا ہوتا گیا۔ یہ حلقہ مولانا مودودی مرحوم کا تھا۔ جماعت اسلامی کے لوگ جب ثابت کرنے پر آتے ہیں کہ تحریک پاکستان میں مولانا مودودی کا بڑا حصہ ہے تو وہ اس اعتبار سے سچ کہتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے خلاف اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے اثبات میں انہوں نے زبردست علمی اور قلمی جہاد کیا۔ اس معاملے میں علامہ

اقبال کے سب سے بڑے شارح مولانا مودودی ہیں۔ لیکن انہوں نے مسلم لیگ اور قائد اعظم سے زبردست اختلاف کیا۔ پاکستان بننے کے بعد ترجمان القرآن کے جو پہلے تین پرچے شائع ہوئے تھے ان میں مولانا مودودی نے اپنے اداریوں میں مسلم لیگ کے قائدین پر بڑی زبردست چارج شیٹ لگائی تھی اور انہیں تقسیم کے وقت بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے قتلِ عام کا مجرم گردانا تھا' صرف یہ احتیاط کی تھی کہ "قائداعظم" کی بجائے "قیادتِ عظمیٰ" کا لفظ استعمال کر کے اس میں عموم پیدا کر دیا تھا۔ مولانا نے لکھا تھا کہ یہ قیادتِ عظمیٰ اس قابل ہے کہ اسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے' اگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ تقسیم ہند پر یہ کچھ ہونے والا ہے تو یہ کودن تھے' بے وقوف تھے' احمق تھے' جاہل تھے اور اگر اندازہ تھا اور اس کے باوجود یہ سب کچھ ہوا ہے تو یہ قاتل ہیں' مجرم ہیں۔

"جوڑ" کا عمل

اب آیئے اس سوال کی جانب کہ جوڑ کا عمل کیسے ہو؟ آپ کے سامنے ہماری مذہبی جماعتوں کا تاریخی اور نظریاتی پس منظر اور اس کا فرق وتفاوت آگیا ہے۔ اس حوالے سے اب آگے کی بحث ہمارے لئے آسان ہو جائے گی۔

دیوبندی اور بریلوی : اِس وقت دیوبندی علماء کے سیاسی عناصر کا ایک مجموعی جنرک نام (Generic Name) جمعیت علمائے اسلام ہے ، اس کے آگے دھڑے ہیں : فضل الرحمٰن گروپ اور سمیع الحق گروپ۔ ایک زمانے میں جمعیت علماء اسلام (حقیقی) بھی بنی تھی جیسے ایم کیو ایم (حقیقی) ہے۔ یہ تین دھاگے ایک ہی لڑی کے ہیں۔ گویا ایک لڑی تین دھاگوں میں بٹ چکی ہے۔ ان کا مذہبی مکتب فکر بھی ایک ہے اور سیاسی مکتب فکر بھی ایک ہی ہے۔ یہ مولانا مدنیؒ کے سیاسی مسلک کے قائلین ہیں اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ ان کے زعماء نے تحریک پاکستان سے کھلم کھلا دوٹوک الفاظ میں اعلانِ براءت کیا اور یہاں تک کہا کہ "پاکستان بنانے کے گناہ میں ہم شامل نہیں تھے"۔ اسی طرح بریلوی مکتب فکر کے علماء کی تنظیم کا جنرک نام جمعیت علمائے پاکستان ہے۔ اس کے بھی دو دھڑے تو نمایاں ہیں ہی ' مولانا نورانی گروپ اور مولانا عبدالستار نیازی گروپ۔ ان کے علاوہ بھی کہیں جمعیت المشائخ کے

عنوان سے اور کہیں کسی اور حوالے سے مختلف اجتماعیتیں بنتی رہتی ہیں۔ کبھی حنیف طیب صاحب نے بھی اپنا ایک چھوٹا سا گروپ بنایا تھا۔

میں بصد ادب ان سب سے عرض کروں گا کہ بھائی' امت کے بڑے اتحاد سے پہلے' خدا کے لئے' ان دھاگوں کو تو بٹ لو۔ "جمعیت علمائے اسلام" تو ایک ہو جائے۔ آپ کے مابین سوائے شخصی قیادت کے اختلاف کے اور کونسا جھگڑا ہے؟ آپ کا سیاسی پس منظر ایک' آپ کے عقائد ایک' آپ کا مسلک ایک' آپ بھی حنفی' وہ بھی حنفی' دونوں دیوبندی' آپ کے بزرگ ایک' وہی مولانا مدنی' مولانا تھانوی' اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی آپ سب کے بزرگ ہیں۔ اسی طرح "جمعیت علمائے پاکستان" سے بھی میری یہی گزارش ہے کہ خدا کے لئے ان تین دھاگوں کو جوڑ کے ایک بڑی لڑی بناؤ۔ آپ کے اتحاد میں کیا رکاوٹ ہے؟ وہ تو چلو دیوبندی ہیں' آپ تینوں تو بریلوی مکتب فکر سے متعلق ہیں۔ لہٰذا خدا کے لئے پہلے اپنے مختلف دھڑوں کو متحد کریں اور پھر بریلوی اور دیوبندی باہم جڑ جائیں۔ ایک زمانے میں اس کی ایک شکل سامنے آئی بھی تھی کہ مولانا نورانی میاں اور مولانا فضل الرحمٰن نے ایک اتحاد قائم کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ اتحاد اس اعتبار سے غیر منطقی تھا کہ ابھی دونوں جمعیتوں کے دھڑے آپس میں نہیں جڑے تھے۔ گویا دھاگے جڑے نہیں اور اوپر لڑی جڑ رہی ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ اتحاد کرنا ہے تو پہلے ان دھاگوں کو تو بٹ لو۔ جمعیت علمائے اسلام کے دھڑے ایک ہو جائیں اور جمعیت علمائے پاکستان کے دھڑے ایک ہو جائیں۔ پھر ان لڑیوں کو آگے بٹا جا سکتا ہے' اس میں قطعاً کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ وہ بھی حنفی' تم بھی حنفی' وہی تصوف کا مسلک تمہارا وہی ان کا' مدارس کا وہی نصاب تمہارا وہی ان کا۔ مدارس اور دار العلوم خواہ دیوبندی ہوں یا بریلوی' ان کے نصاب میں کوئی فرق نہیں۔ ان کے ہاں عقائد کی امہات الکتب ایک ہیں' فقہ' اصول فقہ' منطق اور فلسفے کی کتابیں ایک ہیں۔ حدیثیں ایک ہیں اور قرآن تو ہے ہی ایک۔ پھر یہ دونوں لڑیاں باہم متحد کیوں نہیں ہو سکتیں؟۔

البتہ "ثالثٌ ثلاثۃ" یعنی اہل حدیث حضرات کا ان کے ساتھ جوڑ نہیں ملتا' اس لئے کہ فقہی مسلک کے لحاظ سے ان کی ایک بالکل علیحدہ حیثیت ہے۔ لیکن ان کے بھی بہت

سے دھڑے ہیں۔ آج کل تو زیادہ نام سامنے نہیں آرہے ہیں لیکن ایک زمانے میں ان کے بے شمار دھڑے وجود میں آگئے تھے' جن میں ایک طرف علامہ احسان الٰہی ظہیر کا دھڑا اور دوسری طرف میاں فضل حق صاحب کا دھڑا زیادہ معروف تھے۔ اب بھی ان کے اندر متعدد دھڑے موجود ہیں۔ ان کو بھی چاہئے کہ یہ "جڑنے" کے عمل کا آغاز اپنے اندر تو کریں۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ اگر ہماری مذہبی جماعتیں واقعتاً چاہتی ہیں کہ یہاں اسلام آئے' اگر یہ خالی خولی دعویٰ نہیں ہے' محض سیاسی نعرہ نہیں ہے' اگر حقیقتاً کچھ کرنے کا ارادہ ہے' اگر صورتحال کی سنگینی اور اندرونی و بیرونی خطرات کا کوئی اندازہ ہے اور اگر اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں کے تمام مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ یہاں اسلام قائم کیا جائے تو خدا کے لئے اپنے ان خود ساختہ اختلافات کو ختم کیجئے اور اس کی ترتیب یہی ہو گی جو میں نے بیان کی ہے۔

تبلیغی جماعت اور دعوتِ اسلامی : ایک دوسرے اعتبار سے دیکھئے۔ دیوبندی حلقے سے ایک بہت بڑی تحریک "تبلیغی جماعت" کی صورت میں اٹھی' جو خالص غیر سیاسی' تبلیغی اور اصلاحی تحریک ہے۔ اس کی عمر ستر برس سے زیادہ ہو چکی ہے اور بلا مبالغہ کروڑوں لوگ اس کے ساتھ ہیں' جن میں لاکھوں فعال ہیں۔ اس کی بہت بڑی تنظیم ہے اور اس میں پوری سوسائٹی کا "کراس سیکشن" موجود ہے۔ علماء بھی ہیں' فوجی آفیسر اور جوان بھی ہیں' سول ملازمین بھی ہیں' تاجر بھی ہیں' زمیندار پہلے نہیں تھے اب ان کا بھی کچھ رجحان ہو گیا ہے۔ الغرض معاشرے کے ہر طبقے کے افراد اس سے وابستہ ہیں لیکن اس کے ردِّ عمل میں اب چند سال سے بریلوی طبقہ میں سے دعوتِ اسلامی کے نام سے ایک تحریک اٹھائی جا رہی ہے' جسے آپ تبلیغی جماعت کا "ری پرنٹ" کہہ لیں یا اس کی "کاربن کاپی"۔ بہرحال ابھی اس کی عمر بہت تھوڑی ہے اور اس میں صرف لوئر مڈل کلاس کے تاجر' دستکار یا ملازمت پیشہ افراد شامل ہیں۔ اوپر کے طبقات کے لوگ میرے علم کی حد تک اس میں نہیں ہیں۔ ان سے بھی میں یہی کہوں گا کہ آپ کا جوش و خروش بجا ہے' آپ کی نئی نئی تحریک ہے' لیکن بھائی آپ بھی حنفی ہیں وہ بھی حنفی' آپ بھی صوفی مزاج رکھنے والے ہیں وہ بھی صوفی مزاج ہیں۔ پھر یہ فرق کیوں؟ کیوں یکجا نہیں ہو جاتے؟۔ مل کر کوشش کریں' دین کی دعوت دیں'

اپنے مخصوص شعائر کی دعوت نہ دیں کہ ہری پگڑی ہوگی تو پہچانا جائے گا کہ یہ فلاں ہے۔ یہ تو تفرقہ پیدا کرنے والی باتیں ہیں۔

مشترک وفاق المدارس : تیسرے نمبر پر' جیسا کہ میں نے عرض کیا' دیوبندی اور بریلوی دونوں حلقوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو بہت مخلص اور بہت فعال ہیں۔ یہ خالصتاً غیر سیاسی بھی ہیں اور غیر متحرک بھی۔ میری مراد مدرّسین ہیں جو دار العلوم چلاتے ہیں' بیٹھ کر "قال اللہ و قال الرسول" پڑھاتے ہیں۔ ان کا معاملہ بھی وہی ہے کہ ایک ہی نصاب پڑھا رہے ہیں' وہی کتابیں وہ پڑھا رہے ہیں' وہی آپ پڑھا رہے ہیں' درسِ نظامی کے پورے نصاب میں اول سے آخر تک ان کے مابین کوئی فرق ہے ہی نہیں۔ لہٰذا ان کا ایک ہی وفاق المدارس باآسانی بن سکتا ہے۔ جب دونوں کے نصاب میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے تو پھر یہ صرف علامتی اختلاف اور اس کی وجہ سے تفرقہ آخر کیوں؟ میں پھر عرض کروں گا کہ اگر سنگینیٔ وقت کا کچھ اندازہ ہے کہ حالات کدھر جا رہے ہیں تو ان دھاگوں کو بٹ کر لڑیاں بنانے اور پھر ان لڑیوں کو باہم بٹنے کی پوری سنجیدگی کے ساتھ کوشش ہونی چاہئے۔ خدانخواستہ اب وہ صورت پیش نہ آئے کہ انگریز آ رہا تھا اور ہم جھگڑ رہے تھے' اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان پر ہماری ہزار سالہ حکومت ختم ہو گئی۔ اور جب انگریز گیا تو ملک کا اتنا بڑا حصہ ہندو کے رحم و کرم پر ہو گیا۔ لہٰذا خدارا "فیصلہ ہفت مسئلہ" کے تحت یہ سب جمع ہو جائیں جو ان سب کے مابین متفق علیہ ہے۔

تحریک منہاج القرآن اور تنظیم الاخوان : اس کے بعد اب میں دو تحریکوں کا نام لے رہا ہوں۔ آج میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں تجزیہ مکمل ہو۔ یہ ہیں تحریک منہاج القرآن اور تنظیم الاخوان۔ ان میں پہلی کے قائد علامہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب اور دوسری کے قائد مولانا محمد اکرم اعوان صاحب ہیں۔ ان دونوں کے بارے میں یہ جان لیجئے کہ یہ بہت حد تک فرقہ واریت سے بالاتر ہیں۔ بریلوی اور دیوبندی کی تقسیم کو انہوں نے کسی درجے میں بھی اپنایا نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان دونوں تحریکوں میں بھی پوری سوسائٹی کا کراس سیکشن موجود ہے' چنانچہ سول اور ملٹری بیوروکریسی' وکلاء' ٹیچر' پروفیسر اور تاجر

دونوں میں ہیں۔ ان کے مابین جو تیسری قدر مشترک ہے وہ یہ کہ ان دونوں کے ہاں خوابوں اور روحانیات کا تذکرہ اتنا غیر متناسب ہے کہ یہ مجھے حضور ﷺ 'صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ' تابعین" اور تبع تابعین" میں نظر نہیں آتا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ خواب سچے ہیں یا جھوٹے اور خواب دیکھا بھی ہے یا نہیں دیکھا' یا خواب میں جسے دیکھا ہے وہ کون تھا' وہ واقعتاً فرشتہ تھا یا کوئی شیطان تھا' یہ سب باتیں اللہ کے علم میں ہیں' لیکن بہرحال یہ باتیں دونوں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ ایک کے ہاں تو یہ دعویٰ بھی ہے کہ ہمارے پاس آجاؤ تو ہم براہ راست حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کروا دیں گے' درمیان میں واسطے کا سوال ہی نہیں' اور کشفِ قبور سکھا دیں گے کہ قبر پر کھڑے ہو کر بتا دو کہ یہاں پر کسی کو عذاب ہو رہا ہے یا ثواب مل رہا ہے۔ میرا علم بہت محدود ہے لیکن اس کا کوئی تذکرہ مجھے نہ دورِ رسالت میں ملتا ہے' نہ دورِ صحابہؓ میں' نہ تابعین میں نہ تبع تابعین میں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کا جسدِ مبارک ابھی رکھا تھا' ابھی زیرِ زمین بھی نہیں گیا تھا' اور خلافت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا' اُس وقت صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں مراقبہ کر کے حضور ﷺ سے دریافت کر لیتا ہوں۔ اس سے سارے جھگڑے طے ہو جاتے۔ اور چلئے یہ معاملہ تو جلدی طے ہو گیا' بعد میں جو ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں سے قتل ہوئے' اس خونریزی سے بچنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مراقبہ کیوں نہ کر لیا کہ حضور ﷺ کی روحِ مطہر سے براہ راست راہنمائی حاصل کر لیتے۔ اسی طرح نہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ یہ مراقبہ کر سکے اور نہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کہ براہ راست روحِ محمد ﷺ سے معاملات کا حل دریافت کر لیتے۔ بہرحال یہ چیزیں میرے مزاج سے بُعد رکھتی ہیں۔ ان میں سے کسی کی براہ راست دربارِ نبویؐ تک رسائی ہے اور کوئی بارگاہِ جیلانی سے اپنے حکمنامے اور تقرری کے پروانے لے کر آتے ہیں۔ میں ان چیزوں کو جھوٹ نہیں کہتا لیکن اسے میری وہابیت سمجھ لیجئے کہ مجھے ان چیزوں سے مناسبت نہیں ہے' کیونکہ مجھے بہرحال سلف صالحین میں یہ چیزیں نظر نہیں آتیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کے مرشد مولانا اللہ یار صاحب چکڑالوی سے میری دو مرتبہ ملاقات ہوئی اور میں بعض اعتبارات سے ان سے بہت متاثر ہوا' لیکن اس ایک پہلو کی وجہ سے میں نے

کچھ مغائرت محسوس کی جس کا میں نے آپ کے سامنے اقرار کیا ہے۔

پھر یہ کہ پچھلے دنوں ہم نے ان دونوں تحریکوں کے اکابر سے رابطہ قائم کیا تھا اور اشتراکِ عمل کے امکانات کا جائزہ لیا تھا کیونکہ دونوں انقلاب کا نام لیتے ہیں۔ ایک کا سلسلہ قادریہ ہے ایک کا اویسیہ نقشبندیہ ہے۔ ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ ان کے پیش نظر انقلاب کا لائحہ عمل ہے کیا؟ لیکن اسے ہماری کم فہمی سمجھئے یا سخن ناشناسی کا نام دیجئے کہ ہمیں تاحال کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے سامنے انقلابی عمل کے کیا مراحل ہیں اور وہ کس طور سے انقلاب لانا چاہتے ہیں؟ بہرکیف میری رائے یہ ہے کہ ان دونوں تحریکوں کو یکجا ہو جانا چاہئے' ان میں بہت سے معاملات مشترک ہیں۔

مجلس احرار اور خاکسار تحریک: شروع میں میں نے مجلس احرارِ اسلام کا تذکرہ کیا تھا۔ اسی طرح ماضی میں ہمارے ہاں خاکسار تحریک کا بھی بہت بڑا شہرہ ہوا' لیکن اب یہ دونوں جماعتیں تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بن چکی ہیں۔ البتہ ان سے وابستہ مخلص افراد کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ایسی نئی تحریکوں میں شامل ہو جائیں جو ان کے نظریات سے قریب تر ہیں اور ان کی تقویت کا باعث بنیں۔

جماعت اسلامی ۔ ایک اصولی انقلابی جماعت؟

اور ع اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی!---- اب ذکر ہے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا!---- علامہ اقبال کی ملی شاعری کا ڈنکا ۱۹۰۸ء میں بج چکا تھا' جبکہ مولانا آزاد کی حزب اللہ ۱۹۱۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ ان دو اکابر کے افکار و نظریات سے فیضیاب ہو کر مولانا مودودی میدان میں آئے۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم کی۔ اس سے پہلے انہوں نے متحدہ قومیت کی مخالفت میں جمعیت علماء ہند پر شدید تنقیدیں کیں' جس سے گویا مسلمانوں کی قومی تحریک کو تقویت پہنچی۔ پھر انہوں نے مسلم قوم پرستی کو بھی اسلام کے خلاف قرار دیا اور مسلم قومی تحریک اور مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم کی۔ یہ جماعت اِس وقت کی تمام جماعتوں میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہ ایک شخص کی دعوت اور اس کی فکر پر قائم ہونے والی جماعت ہے۔ اس کے جو

عمدہ و اعلیٰ اوصاف آج تک بھی برقرار ہیں وہ نوٹ کیجئے :

(۱) یہ فرقہ واریت سے بالکل بالاتر ہے۔ اسی بنا پر کوئی انہیں وہابی کہہ دیتا ہے تو کوئی غیر مقلد کا نام دیتا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو فرقہ واریت اور مسلک سے بلند تر رکھا ہے اور جماعت اسلامی کی دعوت کے اندر کسی مسلک یا فرقے کی طرف دعوت شامل نہیں ہے۔

(۲) اس تحریک کا بنیادی فکر اصلِ دین اور اس کی تفہیم' دعوتِ دین' اور اقامتِ دین کی جدوجہد کی دعوت پر مشتمل تھا۔

(۳) اس تحریک میں شامل ہونے والوں کی عظیم اکثریت سکولوں اور کالجوں سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تھی۔ ابتداء میں علماء میں سے کچھ اہلحدیث اور کچھ دیوبندی اکابر بھی شامل ہوئے تھے لیکن جلد یا بدیر وہ اس سے علیحدہ ہو گئے' بلکہ پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے گئے۔ ابتداء میں جماعت میں شامل ہونے والے علماء میں مولانا محمد منظور نعمانی' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' مولانا جعفر شاہ پھلواروی' اور مولانا شاہ صبغت اللہ بختیاری جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ ان چار میں سے کم از کم پہلے دو ناموں سے تو بہت سے لوگ واقف ہوں گے۔ اس کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالغفار حسن' مولانا عبدالجبار غازی اور مولانا عبدالرحیم اشرف کے علاوہ علماء میں سے مختلف لوگ جماعت میں آئے۔ مفتی سیاح الدین کاکاخیل اگرچہ جماعت میں شامل نہیں ہوئے' لیکن اس کے مؤید تھے۔ اسی طرح مولانا محمد چراغ صاحب گوجرانوالہ والے' جو بہت بڑے عالم دین اور مولانا انور شاہ کشمیری کے شاگردِ رشید تھے' وہ بھی جماعت میں شامل نہیں ہوئے' لیکن مولانا مودودی کی تائید کرتے رہے۔ شروع میں اس طرح کے متعدد حضراتِ علم و فضل جماعت میں آئے لیکن اکثریت اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔

(۴) اس تحریک کا سیاسی موقف بھی بالکل منفرد اور یکتا (Unique) تھا' جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں' یعنی ایک طرف متحدہ قومیت کی مخالفت' جو گویا کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کی تائید اور مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ساتھیوں کی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ہم خیال لوگوں کی مخالفت کے مترادف تھی۔ لیکن دوسری طرف تحریکِ

پاکستان سے محض لاتعلقی اور علیحدگی ہی نہیں ' بلکہ اس سے بڑھ کر آخری ایام میں اس کی شدید مخالفت۔

(۵) اہم ترین بات یہ ہے کہ اس تحریک نے بالکل واضح تصور دیا کہ دنیا میں "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے"۔ اس عنوان سے مولانا مودودی کا ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے جو انگریزی میں "The Process of Islamic Revolution" اور عربی میں "منهج الانقلاب الاسلامی" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ میں آج بھی اس کتابچے کو حرف بحرف صحیح سمجھتا ہوں۔ اس موضوع پر مولانا مرحوم نے علی گڑھ کے سٹریچی ہال میں ۱۹۴۰ء میں خطاب بھی فرمایا تھا (اور عجیب اتفاق یہ ہوا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں ' ٹھیک چالیس سال برس بعد ' مجھے بھی وہاں جا کر ایک خطاب کا موقع ملا)۔ مولانا مودودی کے پیش کردہ طریق کار کے دو نکات تو بالکل نمایاں اور واضح تھے جبکہ اس کا تیسرا نکتہ غیر واضح تھا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اسے وقتی مصلحت کی وجہ سے واضح نہ کیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ یہ خود ان کے اپنے ذہن میں بھی واضح نہ ہو۔ اس طریق کار کے دو نکات جو واضح تھے ' وہ یہ تھے کہ (۱) پہلے خود مسلمان بنو ' لیکن نام کے مسلمان نہیں ' بلکہ عملی مسلمان جو حلال و حرام میں تمیز کرنے والے ہوں ' حلال پر کاربند ہوں ' حرام سے مجتنب ہوں اور فرائض کے پابند ہوں۔ (۲) پھر ایک مضبوط ڈسپلن والی جماعت میں شامل ہو جاؤ ' اور اپنے تن من دھن کو اسی دعوت کے پھیلانے میں لگا دو۔ اس پر مولانا مرحوم نے ایک معرکۃ الآراء مضمون "ایک صالح جماعت کی ضرورت" کے عنوان سے لکھا تھا ' جس کے نتیجے میں پھر ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم ہوئی۔ اور یہ کام درحقیقت سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۴ کے حوالے سے ہوا تھا:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲ ' ۱۰۳ اور ۱۰۴ کی روشنی میں اب میری ایک کتاب "امتِ مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحہ عمل" کے عنوان سے موجود ہے۔ ان تین آیات میں

ایک مکمل لائحہ عمل بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلی آیت (نمبر ۱۰۲) میں ایک انفرادی لائحہ عمل دیا گیا ہے، یعنی امت کے افراد تقویٰ اختیار کریں، خود متقی اور پرہیز گار بنیں:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾

"اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور دیکھنا تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر اس حال میں کہ تم (اللہ کے) فرمانبردار رہو"۔

دوسری آیت (نمبر ۱۰۳) میں حیاتِ ملّی کے استحکام کا نکتہ بیان کر دیا گیا ہے کہ جب مسلم اجتماعیت کی ہر اینٹ پختہ ہو جائے تو پھر ان اینٹوں کو باہم کیسے جوڑا جائے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا....﴾

"اور اللہ کی رسی (یعنی قرآن) سے مجموعی طور پر چمٹ جاؤ، اور باہم تفرقہ میں مت پڑو..."

تیسری آیت (نمبر ۱۰۴) میں اجتماعی لائحہ عمل بیان کر دیا گیا کہ اب ایسے افراد باہم مل کر ایک اجتماعیت وجود میں لائیں، ایک جماعت بنائیں، جو تین کام کرے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

"اور چاہئے کہ تم سے ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور بدی سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

مجھے مولانا مودودی کے بیان کردہ طریق کار پر آج بھی صد فی صد یقین ہے، سوائے اس ایک مسئلے کے کہ جب یہ فضا تیار ہو جائے تو آخری قدم کیا ہوگا؟ مولانا کے اس مقالے میں یہ نکتہ غیر واضح اور تشنہ ہے۔

بہرحال میں نے اِس وقت جماعت اسلامی کی خصوصیات کے حوالے سے جو پانچ نکات بیان کئے ہیں ان کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جماعت اسلامی کا آغاز ایک خالص اصولی اسلامی انقلابی

جماعت کے طور پر ہوا تھا۔ وہ نہ تو معروف معنی میں کوئی سیاسی جماعت تھی اور نہ ہی معروف معنی میں کوئی مذہبی جماعت تھی' اس لئے کہ وہ فرقہ واریت کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اسے ہماری بد قسمتی کہئے یا جماعتی قیادت کی کوتاہی کہ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے غلط قدم اٹھایا اور انتخابی سیاست میں کود پڑے۔ ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی نے بھرپور حصہ لیا اور اس کے نتیجے میں پوری تحریک کی قلبِ ماہیت ہو گئی۔

میں نے جماعت کے بارے میں ۱۹۵۶ء میں یہ الفاظ لکھے تھے کہ :

"یہ جماعت خالص اصولی اسلامی انقلابی جماعت کی بجائے ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت بن گئی ہے"۔

اپنے اس تجزیئے میں میں نے تین الفاظ کو تین الفاظ کے مقابلے پر رکھا ہے 'اصولی' اسلامی' انقلابی بمقابلہ اسلام پسند' قومی' سیاسی جماعت۔ ۱۹۵۶ء میں مَیں نے جماعت اسلامی کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے ایک مفصل بیان تحریر کیا تھا' جسے دس برس بعد ۱۹۶۶ء میں اڑھائی سو صفحے کی کتاب کی صورت میں "تحریکِ جماعت اسلامی' ایک تحقیقی مطالعہ" کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ کتاب آج بھی شائع ہوتی ہے اور اس میں میری ۱۹۵۶ء کی تحریر حرف بحرف جوں کی توں موجود ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔

جماعت اسلامی کے تین "خروج"

تین مختلف مراحل پر جماعت اسلامی سے جو خروج (Exodus) ہوئے ہیں' اب کچھ تذکرہ ان کا بھی ہو جائے۔ پہلا خروج جماعت کے قیام کے دو سال بعد ہی ۱۹۴۳ء میں ہو گیا تھا' لیکن یہ خالص شخصی بنیادوں پر تھا۔ حلقہ دیوبند کے علماء کی اکثریت جو جماعت میں آئی تھی اس نے جلد ہی اس رائے کا اظہار کیا کہ مولانا مودودی مرحوم جو کام لے کر اٹھے ہیں یہ کام اگرچہ بہت صحیح ہے اور بہت بلند ہے لیکن مولانا مودودی کی اپنی شخصیت اور ان کا اپنا تقویٰ اور تدیّن اس معیار کا نہیں ہے جو اس کام کے لئے ضروری ہے۔ یہ اختلاف نہ نظریاتی اختلاف تھا نہ پالیسی کا' بلکہ صرف شخصی اختلاف تھا۔ چنانچہ اس موقع پر مولانا منظور

نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی سمیت جماعت کے قریباً ایک تہائی ارکان جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

اس کے بعد دوسرا ایکسوڈس یا خروج ۵۷-۱۹۵۶ء میں ہوا، جس کے اندر میں بھی شامل تھا، اور مولانا مودودی کے دستِ راست مولانا امین احسن اصلاحی بھی شامل تھے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس مرحلے پر جماعت سے الگ ہونے والوں میں گویا چوٹی پر اصلاحی صاحب کا اور فرش پر میرا نام تھا اور درمیان میں آپ درجہ بندی کرتے چلے جایئے، ہر درجے کے لوگ شامل تھے۔ اس کی بنیاد خالص پالیسی کا اختلاف تھا۔ الگ ہونے والوں کا موقف یہ تھا کہ ہم نے الیکشن میں حصہ لے کر اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر سیاسی بنا لیا ہے اور اس طرح ہم ایک غلط موڑ مڑ آئے ہیں، لہٰذا یہاں سے واپس مڑ کر ہمیں اسی علمی و فکری اور ذہنی انقلاب کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور عملی انقلاب کی جدوجہد پر اپنی پوری توجہات کو مرکوز کر دینا چاہئے۔ اس مرحلے پر تقریباً تمام اہلحدیث علماء بھی جماعت سے نکل گئے اور جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے تقریباً نصف ارکان جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ مولانا اصلاحی صاحب کو شورش کاشمیری مرحوم کبھی مولانا مودودی کے "اینجلز" لکھا کرتے تھے اور کبھی ان کے "حکیم نور الدین" قرار دیتے تھے۔ یعنی مولانا اصلاحی صاحب کی حیثیت مولانا مودودی کے ساتھ ایسی تھی جیسے مارکس کے ساتھ اینجلز جڑا ہوا تھا، یا جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کو سارا علمی مواد حکیم نور الدین فراہم کیا کرتا تھا۔ لیکن مولانا اصلاحی بھی اس مرحلے پر جماعت سے علیحدہ ہو گئے، بلکہ انہوں نے مولانا مودودی پر ایک الزام ذاتی بھی لگایا کہ ان کے مزاج میں آمریت ہے مشاورت نہیں، جبکہ جماعت کا دستور جمہوری تھا اور جماعت کو ایک دستوری بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔

تیسرا ایکسوڈس ۹۵-۱۹۹۴ء میں ہوا۔ اس میں علیحدہ ہونے والوں میں سے نمایاں ترین نام نعیم صدیقی صاحب کا ہے۔ نعیم صدیقی اس اعتبار سے نہایت اہم ہیں کہ پنجاب میں مولانا مودودی کے ساتھ جو سب سے پہلا شخص متعلق ہوا وہ جناب نعیم صدیقی ہیں۔ وہ جماعت اسلامی کے قائم ہونے سے بھی تین سال پہلے مولانا کے ساتھ منسلک ہوئے جب علامہ اقبال کی دعوت پر مولانا مودودی دارالسلام (پٹھانکوٹ، ضلع گورداسپور) آئے تھے۔

باقی سب لوگ بعد کی پیداوار ہیں۔ اور اب انہوں نے جماعت کی حالتِ زار پر بڑے درد انگیز مرثیے کہے ہیں۔ ان کا جماعت سے اب جو اختلاف ہوا ہے اس میں پالیسی کا اختلاف کم ہے اور خاص طور پر قاضی حسین احمد صاحب کی شخصیت کے حوالے سے زیادہ ہے۔ حالیہ انتخابات میں' بقول ان کے' جو رکیک اور مبتذل قسم کی حرکات کی گئی ہیں انہوں نے جماعت کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملادی ہے۔ گویا۔

پہلے ہی اپنی کونسی ایسی تھی آبرو
پر شب کی منتوں نے تو کھو دی رہی سہی

اور ان کا کہنا ہے کہ اس سے بھی بڑھ کر معاملہ مالیاتی سکینڈلز کا ہے۔ اس حلقے کے اندر یہ بات عام کہی جا رہی ہے کہ قاضی صاحب نے پہلے نواز شریف سے دس کروڑ لیا تھا' پھر منحرف ہو گئے اور پھر حکومت سے دس کروڑ لے کر اپنا علیحدہ محاذ قائم کیا۔ واللہ اعلم۔ میں صرف ان کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ بہرحال انہوں نے ایک جماعت بھی بنالی ہے اور اس کا کنونشن بھی ہوا ہے۔ پہلے اس کا نام "تحریکِ فکرِ مودودی" تھا اور اب یہ "تحریکِ اسلامی" کے نام سے جمع ہو چکے ہیں۔ جماعت سے الگ ہو کر جتنے لوگ ان کے ساتھ آئے ہیں ان سے زیادہ وہ ہیں جو آنے کو تیار بیٹھے ہیں' کیونکہ جماعت کے اندر ابھی اس حلقے کے کافی ہم خیال لوگ موجود ہیں۔

جماعت اسلامی کے خروج ۔ نتائج کے آئینے میں!

اب ذرا یہ دیکھ لیجئے کہ ہر مرحلے پر ہونے والے خروج (exodus) کے کیا نتائج نکلتے رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ جو لوگ علیحدہ ہوئے ان کے اکابر تبلیغی جماعت میں چلے گئے۔ ان میں مولانا علی میاں بھی تھے اور مولانا منظور نعمانی بھی۔ باقی لوگ اپنے اپنے طریقے سے کسی کام میں لگ گئے۔

دوسرے مرحلے پر یعنی ۵۷۔۱۹۵۶ء میں جو اختلاف ہوا اس کے بعد پہلے پہل بہت کوششیں ہوئیں کہ کوئی جماعت سازی ہو جائے اور ایک جماعت بن جائے۔ اس سلسلے میں مولانا اصلاحی صاحب نے بھی بڑی کوششیں کیں' مگر ناکامی ہوئی۔ لیکن اُس وقت ایک

نوجوان نے ' جو اَب بوڑھا ہو گیا ہے اور آپ سے مخاطب ہے ' اپنی جدّوجہد کو برقرار رکھا ' جس کے نتیجے میں ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی۔ اس تنظیم میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور یہ اکثروبیشتر نئے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ؏ "اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے" کے مصداق میرے اپنے دروسِ قرآن ' میری تقریروں اور تحریروں کے نتیجے میں لوگ جمع ہوئے ہیں۔ لیکن میرا موقف یہ ہے کہ میں اسی اصل تحریکِ جماعت اسلامی کا تسلسل ہوں۔ میں اب بھی اپنے آپ کو اسی کی طرف منسوب کرتا ہوں۔ اپنی منزل سے انحراف سے پہلے کی جو جماعت تھی میں اس کے ساتھ متفق ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ میں اسی نہج پر کام کر رہا ہوں۔

تیسرے مرحلے پر ' جیسا کہ میں نے عرض کیا ' نعیم صدیقی صاحب اور ان کے ساتھی پہلے تحریک فکر مودودی کے نام سے اور اب تحریک اسلامی کے نام سے جمع ہو گئے ہیں۔ پچھلے دنوں جب میرے چھوٹے بھائی برادرم اقتدار احمد کا انتقال ہوا تو ایک عجیب سی صورت پیدا ہو گئی کہ قاضی حسین احمد صاحب اور نعیم صدیقی صاحب میرے پاس تعزیت کے لئے آئے تو اتفاقی طور پر دونوں ایک ہی وقت پر پہنچ گئے۔ میں نے اس وقت بھی سورۂ انفال میں وارد شدہ یہ قرآنی الفاظ پڑھے تھے : "لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ" یعنی اگر آپ پہلے سے طے کر کے آتے کہ ایک ہی وقت میں جانا ہے تب بھی کچھ آگے پیچھے ہو جاتا ' لیکن اللہ نے آپ کو یہاں جمع کر دیا ہے۔ پھر ہمارا اس موقع کا ایک فوٹو بھی "ندائے خلافت" میں چھپ گیا جس میں درمیان میں ' میں بیٹھا ہوں ' میرے دائیں ہاتھ جناب نعیم صدیقی صاحب اور بائیں ہاتھ قاضی حسین احمد صاحب ہیں۔

جماعت ' تنظیم اور تحریک ---قدرِ مشترک اور مابہ الاختلاف امور

یہ جو تینوں دھڑے ہیں ان کے مابین کیا چیز قدر مشترک ہے اور کیا مابہ الاختلاف ہے؟ اس کو نوٹ کر لیجئے۔ یہ بھی ایک ہی لڑی کے تین دھاگے ہیں ' اسی طرح جیسے جمعیت علماء اسلام کی لڑی کے تین دھاگے ہیں ' اور جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت اہلحدیث کی لڑیوں کے مختلف دھاگے ہیں۔ اس لڑی کے جو یہ تین دھاگے ہیں ان میں مندرجہ ذیل اقدار

مشترک ہیں :

(۱) دین کا ہمہ گیر تصور کہ وہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو اپنا غلبہ اور مکمل تسلّط چاہتا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں سے جزوی اطاعت نہیں بلکہ مکمل اطاعت اور انقیاد کا مطالبہ کرتا ہے۔

(۲) فرائض دینی کا یہ تصور کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کرنا ہر بندۂ مومن کا فرض عین ہے۔ اگر وہ یہ نہیں کرتا تو قانونی مسلمان تو شمار ہو سکتا ہے حقیقی مومن شمار نہیں ہو سکتا۔ ان تصورات پر ہم سب متفق ہیں۔

(۳) مولانا مودودی مرحوم نے "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے" میں جو اساسی طریق کار پیش کیا ہے اس پر بھی ہم سب کا اتفاق ہے۔ یعنی پہلے خود مسلمان بنو، پھر معاشرے اور ریاست کو مسلمان بنانے کے لئے ایک منظم جماعت میں شامل ہو کر تن من دھن سے کوشش کرو۔ پھر اس میں بھی ہمارا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ سارا کام قرآن کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ ایک بات نوٹ کر لیجئے کہ مولانا مودودی ایک بہت بڑے مصنف اور مفکر تھے اور ان کی بعض تعبیرات اور علمی آراء سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن اِس وقت میں مولانا مودودی کی نہیں، جماعت اسلامی کی بات کر رہا ہوں۔ چنانچہ مولانا مودودی کے بیان کردہ علمی مسائل، تعبیرات اور تشریحات سے قطع نظر، اصل تحریک کے دو تصورات یعنی دین کا تصور اور فرائضِ دینی کا تصور ہمارے درمیان قدرِ مشترک ہیں۔ اس کے علاوہ انقلابِ اسلامی کا اساسی طریق کار، جس کی توضیح "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے" نامی پمفلٹ میں ہے، وہ بھی متفق علیہ ہے یعنی پہلے خود مسلمان بنو، حلال اور حرام پر کاربند رہو، پھر باہم جڑو اور ایک منظم طاقت بنو اور اب یہ طاقت استعمال ہوگی دین کو غالب کرنے کے لئے۔ البتہ دین کے غلبے کے لئے آخری قدم کیا ہو گا؟ یہ معاملہ ہمارے مابین بنائے نزاع ہے۔ کیا وہ الیکشن ہے؟ تنظیم اسلامی کا موقف اس اعتبار سے سخت ترین ہے کہ الیکشن سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ نعیم صدیقی صاحب کی زیر قیادت بننے والی تحریک اسلامی بھی الیکشن سے تقریباً تائب ہو چکی ہے۔ البتہ جماعت اسلامی، جسے اِس وقت "قاضی حسین احمد اینڈ کمپنی" سے تعبیر کیا جا

سکتا ہے، یعنی جماعت کے موجودہ امیر اور اس کے عام کارکن جو اسی سیاسی دور کی پیداوار ہیں، وہ اس پر عازم اور جازم ہیں کہ اِس وقت راستہ تو بس یہی الیکشن کا راستہ ہے۔

الیکشن میں حصہ لینے کے بارے میں تنظیم اسلامی کا موقف

اب ذرا یہ سمجھ لیجئے کہ الیکشن کے بارے میں میرا اور تنظیم اسلامی کا اب تک موقف کیا ہے؟

(۱) ہمارے نزدیک تاریخ انسانی میں آج تک کوئی انقلاب انتخابات کے ذریعے نہیں آیا۔ (واضح رہے کہ انقلاب سے مراد Politico-Socio Economic System میں کوئی بنیادی تبدیلی ہے) یہ بات تاریخی طور پر طے شدہ ہے۔ انتخابات کے ذریعے سے نہ ایران میں آیت اللہ خمینی کی حکومت بن سکتی تھی اور نہ معاذاللہ، ثم معاذاللہ، الیکشن کے ذریعے سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں اور پھر پورے جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی حکومت قائم کر سکتے تھے۔ یہ میں نے چودہ سو برس کے فصل سے دو مثالیں آپ کے سامنے پیش کر دی ہیں، درمیانی خلا آپ خود پُر کر لیجئے۔

(۲) ہمارے نزدیک الیکشن پہلے سے قائم کسی نظام کو چلانے کے لئے ہوتے ہیں، کسی نظام کو تبدیل کرنے کے لئے نہیں۔ امریکہ میں دونوں انتخابی حریف یعنی Democrates اور Republicans امریکہ میں قائم نظام پر متفق ہیں۔ ان کے مابین فرق صرف پالیسی سے متعلق بعض معاملات میں ہے۔ مثلاً ٹیکسیشن پالیسی میں کوئی باریک سا فرق ہو گا، یا اسی طرح ہیلتھ پالیسی میں کوئی معمولی فرق ہو گا۔ اسی طرح انگلستان میں خواہ لیبر پارٹی ہو یا کنزرویٹو پارٹی، ملک میں رائج موجودہ نظام پر ان دونوں کا اتفاق ہے۔ ہاں بعض جزوی معاملات میں مثلاً تارکین وطن کے بارے میں پالیسی پر یا ٹریڈ یونینز پالیسی پر ان کے مابین اختلاف ہو سکتا ہے۔ بہرکیف الیکشن ہوتے ہیں کسی نظام کو چلانے کے لئے، بدلنے کے لئے نہیں۔

(۳) الیکشن خواہ کتنے ہی صاف و شفاف اور غیر جانبدارانہ و منصفانہ کیوں نہ ہوں،

معاشرے میں موجود جو بھی اقتصادی Power bases ہوں گے یا بالفاظِ دیگر معاشی و اقتصادی ڈھانچے پر جن طبقات کا تسلط ہو گا' ان انتخابات کے نتائج میں انہی کی reflection (عکاسی) ہو گی۔ اگر وہاں جاگیرداری نظام قائم ہے تو کوئی جاگیردار ہی انتخابات کے ذریعے اوپر آئے گا۔ اسی پچاسی فیصد نشستوں پر وہی قابض ہوں گے' باقی پندرہ بیس فیصد محض ڈگڈگی بجاتے رہ جائیں گے۔ اصل کھیل تو جاگیردار ہی کھیلے گا' چاہے وہ روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے پہ آیا ہو اور چاہے کسی اور نعرے کے بل پر اسمبلی میں پہنچا ہو' لیکن جاگیردار بہرحال جاگیردار ہی رہے گا خواہ وہ اپنے اوپر کوئی بھی لبادہ اوڑھ لے۔ بھٹو کو اللہ نے جاگیرداری نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کا موقع دیا تھا۔ اگر وہ اپنے سوشلزم کے ساتھ ہی مخلص ہو تا تو وہ اس ملک کا ماؤزے تنگ بن سکتا تھا' لیکن وہ بھی اپنی جاگیردارانہ کھال (Skin) سے باہر نہ نکل سکا اور اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اندر سے وہ بھی جاگیردار ہی تھا۔ لہٰذا موجودہ مروجہ نظام کے تحت جب بھی الیکشن ہوں گے' نتیجہ وہی نکلے گا۔ وہی جاگیردار طبقہ آپ کو اسمبلی کی نشستوں پر براجمان اور اقتدار کی غلام گردشوں میں متحرک نظر آئے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ کچھ نام بدل جائیں گے یا کچھ چہرے بدل جائیں گے' بات وہیں کی وہیں رہے گی۔ اِس وقت ایک بہت بڑے جاگیردار یعنی سر جمال خان لغاری کا پوتا آپ کا صدر ہے اور ایک بہت بڑے جاگیردار یعنی سر شاہ نواز بھٹو کی پوتی آپ کی وزیراعظم ہے۔ دونوں "سروں" کی اولاد ہیں۔

مذکورہ بالا تین نکات سے ہم جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ یہ ہے کہ نظام اسلام کے قیام کے لئے الیکشن میں حصہ لینا "Exercise in futility" کے سوا کچھ نہیں ہے' یہ محض قوت اور وقت کا ضیاع ہے۔ تاہم الیکشن کے بارے میں اپنے اس موقف کا بھی میں ہمیشہ اظہار کرتا رہا ہوں کہ یہ حرام نہیں ہیں۔ میں نے مولانا صوفی محمد صاحب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کئی بار کیا ہے جو مالاکنڈ کی تحریک نفاذِ شریعت کے قائد ہیں۔ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ الیکشن میں ووٹ دینا بھی حرام ہے اور الیکشن لڑنا بھی حرام ہے۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا تھا۔ دیر کے ایک دور دراز علاقے میں "میدان" نام کا ایک مقام ہے' جہاں صوفی صاحب رہائش

پذیر تھے۔ میں ان سے ملنے کے لئے وہاں پہنچا اور عرض کیا کہ مولانا! میں اس حد تک آپ سے متفق ہوں کہ الیکشن کا اس لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے سے دین نہیں آ سکتا، لیکن آپ اس کو حرام کہہ رہے ہیں تو اس کے لئے کوئی وزنی دلیل درکار ہے۔ اس کے لئے آپ کو علماء کے سامنے اپنے دلائل پیش کر کے ان کا اتفاقِ رائے حاصل کرنا چاہئے۔ میں بہرحال اسے حرام نہیں کہہ سکتا اور میں نے کبھی بھی اس کو حرام قرار نہیں دیا۔

دوسرے، میں یہ بھی ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ جو لوگ خلوص و اخلاص کے ساتھ قائل ہیں کہ اس ذریعے سے یہاں واقعتاً کوئی تبدیلی آ سکتی ہے، اسلامی نظام آ سکتا ہے تو وہ ضرور اس کے لئے کام کریں، تاہم ایسے لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ باہم متحد ہو جائیں، تاکہ اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لینے والے تو ایک پلیٹ فارم پر آ جائیں۔ اگر آپ نے اسلام کو ایک پارٹی ایشو بنا ہی لیا ہے تو معاشرے میں اسی بنیاد پر polarization ہو جانی چاہئے۔ سیکولر ذہن کے لوگ ایک طرف ہوں اور مذہبی ذہن کے لوگ ایک طرف۔ اور اگر مذہبی کیمپ پانچ حصوں میں بٹا ہوا ہو گا تو پھر وہی کچھ ہو گا جو اب تک ہو رہا ہے کہ دن بدن عزت کا دھیلا ہو رہا ہے۔ علماء کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ان کے کچھ بیانات ضرور اخبارات میں چھپ جاتے ہیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشرے پر علماء کی گرفت بتدریج ڈھیلی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور یہ سارا نتیجہ اس غلط حکمت عملی کا ہے جو ان کی طرف سے اختیار کی گئی ہے۔

ایک اہم پیشکش ---- ایک قابلِ عمل تجویز
تینوں جماعتوں پر مشتمل "وفاق" کا قیام

اب اس کے ساتھ ساتھ میری ایک پیشکش (offer) ہے جو میری آج کی معروضات کا آخری نکتہ ہے۔ میں یہ آفر مسلسل کرتا رہا ہوں کہ اگر جماعت اسلامی انتخابات سے تائب ہو جائے تو میں اور میری ساری تنظیم ان میں مدغم ہو جائیں گے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایک شخص اپنے بارے میں تو کوئی فیصلہ کر سکتا ہے مگر اپنی تنظیم کے بارے میں یہ بات

کیسے کہہ سکتا ہے؟ لیکن میں یہ بات اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ میری تنظیم بیعت کی بنیاد پر قائم ہے اور جماعت اسلامی میں شامل ہونے کا میرا حکم ہرگز کوئی حرام کام کا حکم نہیں ہے، لہٰذا میرے رفقاء اپنی بیعت کی بنیاد پر پابند ہیں کہ اگر میں یہ فیصلہ کروں تو انہیں اس میں شریک ہونا ہو گا۔

اس کے کچھ عرصے بعد میں نے اس آفر میں کچھ مزید نرمی کی کہ اگر جماعت اسلامی پچیس برس یا بیس برس کے لئے ہی الیکشن سے مجتنب رہنے کا فیصلہ کر لے تو میں اپنی جماعت کو اس میں مدغم کر دوں گا۔

اِس وقت میں ایک درجہ مزید نیچے اتر رہا ہوں اور اس طرح میں آخری بار اتمامِ حجت کر رہا ہوں۔ میری یہ تجویز پانچ حصوں پر مشتمل ہے :

(۱) جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی، یہ تینوں تنظیمیں ایک وفاق کی شکل اختیار کر لیں۔ اِس وقت میری یہ آفر اِدغام کی نہیں، وفاق کی ہے، کیونکہ ہمارا نظام بیعت کا ہے اور ان کا دستوری ہے۔

(۲) اس وفاق میں شامل تینوں تنظیمیں مشترکہ طور پر عوام کی بھرپور ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت میں سرگرم ہو جائیں اور اس کے لئے اپنی تمام تر افرادی قوت اور معاشی وسائل و ذرائع کو بروئے کار لائیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے بڑے سے بڑے پیمانے پر لوگوں کے اذہان کو بدلنے کی کوشش کی جائے، تاکہ سیکولرزم، مغربی جمہوریت اور مغربی تہذیب کی مرعوبیت دماغوں سے نکلے اور اسلام کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام پر اعتماد پیدا ہو۔ لوگوں کو یہ بھی بتلایا جائے کہ موجودہ دور میں نظام خلافت کا نیا ڈھانچہ کیا ہو گا؟ یہ ہمارے کرنے کا ایک بہت بڑا، کوہ ہمالیہ جتنا بڑا کام ہے، جس کے لئے ہمیں اپنی قوتوں، صلاحیتوں اور وسائل و ذرائع کو مشترکہ طور پر بروئے کار لانا چاہئے اور اس ساری جدوجہد کے لئے مرکز و محور ہونے کی حیثیت قرآن حکیم کو حاصل ہونی چاہئے۔ اس میں اختلاف کی کوئی بات نہیں۔

(۳) انتخابات میں حصہ لینے کے ضمن میں ہم مولانا مودودی کے ۱۹۴۵ء کے موقف پر جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ آخری اتمامِ حجت ہے جو میں جماعت اسلامی پر کر رہا ہوں۔ "رسائل

و مسائل" (جو ان کی اپنی شائع کردہ کتاب ہے) کی جلد اول صفحہ ۳۷۵ پر مندرج یہ عبارت ملاحظہ ہو' جو دراصل ایک سوال کے جواب میں دسمبر ۴۵ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں :

"الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لئے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقہ سے سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم یہ طریق کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جبکہ :-

اولاً' ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لئے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لئے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً' ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً' انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔"

یہ مولانا مودودی مرحوم کا دسمبر ۱۹۴۵ء یعنی قیامِ پاکستان سے پونے دو سال پہلے کا موقف ہے۔ اب اس کے ہوتے ہوئے انہوں نے ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں کیسے حصہ لیا' یہ ایک علیحدہ بحث ہے' جس میں مَیں نہیں جانا چاہتا۔ انسان سے غلطی ہو سکتی ہے' نسیان بھی ہو سکتا ہے' "الانسانُ مرکبٌ من الخطأ والنِسیان"۔ اس پہلے ہی الیکشن کے بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ ناکامی اس لئے ہوئی کہ مذکورہ بالا تین شرطیں پوری نہیں تھیں' ورنہ تو کامیابی ہوتی۔ لہٰذا جماعت کو اس سے رجوع کر لینا چاہئے تھا' لیکن افسوس یہ ہے کہ

پھراس پر اصرار رہااور ہر آنے والے الیکشن میں درجہ بدرجہ نیچے اترتے گئے۔ (اس موضوع پر "مولانا مودودی مرحوم اور انتخابات" کے عنوان سے ایک مضمون ستمبر ۹۵ء کے میثاق میں شائع کیا جاچکا ہے۔ تفصیل وہاں سے دیکھی جاسکتی ہے)

یہ تینوں جماعتیں جو وفاق بنائیں وہ کسی الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ اُس وقت کرے جب کہ مولانا مودودی مرحوم کی معیّن کردہ وہ تین شرائط پوری ہو چکی ہوں۔ یہ شرائط جماعت اسلامی پر بھی حجت ہیں اور تحریکِ اسلامی پر بھی' کیونکہ وہ اصلاً ہے ہی "تحریکِ فکرِ مودودی" اور ان شرائط کو میں بھی درست تسلیم کرتا ہوں۔ اب حل طلب مسئلہ صرف یہ رہ گیا کہ یہ assessment کون کرے گا کہ مطلوبہ فضا تیار ہو گئی یا نہیں؟ یہ اندازہ کس طرح ہو گا کہ حقیقت میں یہ شرائط پوری ہو گئیں یا نہیں؟ اس کے لئے میں یہ تجویز دے رہا ہوں کہ تینوں جماعتوں کی ایک مشترک مجلس مشاورت قائم کی جائے' جس میں پچاس فیصد نمائندگی جماعت اسلامی کی ہو' ۲۵ فیصد نمائندگی نعیم صدیقی صاحب کی تحریک اسلامی کو دے دی جائے جو اگرچہ ابھی ایک نوزائیدہ جماعت ہے اور صحیح معنوں میں جماعت کہلانے کی حقدار بھی نہیں ہے' لیکن میں نعیم صدیقی صاحب کو اپنا بزرگ مانتا ہوں۔ اور بقیہ صرف ۲۵ فیصد پر میں خود قناعت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ وہ تنظیم اسلامی کی ہو۔ اگر اس مجلس مشاورت کی دو تہائی اکثریت یہ فیصلہ کردے کہ یہ شرائط پوری ہو گئی ہیں' بشرطیکہ اس میں ہر جماعت کی بھی کم از کم نصف تعداد شامل ہو' تو یہ وفاق الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر دے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ نہ ہو کہ دو جماعتیں مل کر دو تہائی اکثریت ظاہر کر دیں اور تیسری جماعت "ایل پی ڈبلیو" ہو جائے۔

اس ضمن میں آخری بات یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ میری آخری آفر (offer) ہے اور یہ سابقہ ساری offers کی ناسخ ہے۔ چنانچہ قبل ازیں میں جماعت اسلامی کے ساتھ تنظیم اسلامی کے ادغام کی جو پیشکش کر چکا ہوں اسے اب منسوخ سمجھا جائے اور اگر میری یہ آخری پیشکش بھی قبول نہیں تو پھر معاملات جس طرح چل رہے ہیں اسی طرح چلیں گے' بلکہ بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی کی بھی خیر نہیں ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

تنظیمِ اسلامی کا پیغام نظام خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک

اسلامی انقلابی جماعت ہے

جو اولاً پاکستان میں اور بالآخر ساری دنیا میں دین حق یعنی

اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر نظامِ خلافت

قائم کرنا چاہتی ہے

امیر: ڈاکٹر اسرار احمد